

عزیزم کے نام

عزیزم کے نام

ڈاکٹر تاثیر

مرتّب

محمود نظامی

ناشر

ادارۂ فروغِ اردو - لاہور

بارِ اوّل

قیمت ۲/۸/

محمد طفیل مالک ادارۂ فروغِ اردو نے اشرف پریس لاہور سے چھپوا کر
شائع کی

یہ مجموعہ اُن مکاتیب پر مشتمل ہے۔ جو مرحوم نے
کیمبرج کے دورانِ قیام میں اپنے ایک شاگرد
کو لکھے

محمود نظامی

پہلی بات

یہ اوراق جس ترتیب سے قارئین تک پہنچ رہے ہیں، اس کی اپنی ایک کہانی بھی ہے۔ یہ خطوط جن میں تاثیر مرحوم کی بوقلموں شخصیت، ان کے وسیع مراسم، ہوائی شفقت اور چند در چند علمی مباحث پر روشنی پڑتی ہے، آج سے برسوں پہلے طباعت کے لئے ترتیب دیئے گئے، مسودہ تیار ہو چکا تو مرتب نے اسی میں عافیت سمجھی کہ صاحبِ مکاتیب، تاثیر مرحوم کو اس کی سن گن نہ ہو۔ آخر پبلشر کے ہاں سے کتابت شدہ کاپیاں درستی کے لئے طلب۔ غلام عباس مصنف آنندی نے ان کاپیوں کو دیکھنے کا کام اپنے ذمے لیا۔ لیکن بہ سبیل تذکرہ تاثیر کو بھی مسودے کی اطلاع دیدی۔ تاثیر نے فوراً مطالبہ کیا کہ جب ان کے خطوط کی یوں تشہیر کی جا رہی تھی تو آخر انہیں مکمل صورت میں مسودہ دیکھنے کا حق ملنا چاہیئے۔ ان کی دلیلوں کے سامنے کسے انکار کی مجال ہو سکتی تھی۔ مرتب نے کچھ ذہنی کشمکش کے ساتھ مسودہ تاثیر کے حوالے کر دیا۔

دو ہفتے گذر گئے۔

آخر ناشر کے بڑھتے ہوئے تقاضوں سے مجبور ہو کر مرتب نے تاثیر سے جب مسودے کا تقاضا کیا، تو وہ نہ صرف اس سے بہت خفا ہوئے بلکہ اپنے خطوط کی نوعیت، ادب میں خطوط کے مجموعوں کی تاریخ، ان کی اہمیت، ان کی افادی ضرورت اور ایسے ہی کئی نکات پر ایک طویل خطبہ دے دیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ کچھ بھی ہو، یہ خطوط شائع نہیں ہوں گے۔ کیونکہ "میں ابھی زندہ ہوں، بقائمی ہوش و حواس تمہارے سامنے موجود ہوں۔ ان خطوط کی اشاعت میرے مرنے کے بعد ہو تو ہو۔"

اور یہ مسودہ جوں کا توں مرتّب کے پاس دکھا رہا، کیونکہ صاحبِ مکاتیب کی شرط ایسی تھی جس پر کسی بشر کو اختیار حاصل نہ تھا۔

مُلکی تقسیم کے بعد مرتّب جب دہلی سے لاہور آیا تو مکاتیب کا یہ مسودہ کتابت شدہ حالت میں اس کے سامان کے ساتھ بخیریت وطن پہنچ گیا۔ لیکن پھر اچانک یوں گم ہُوا گویا وہ خود ہی وقت سے پہلے چھپنا نہیں چاہتا۔ جب تلاش بے کار ثابت ہوئی تو مرتّب کے حافظے سے ان کی ترتیب و اشاعت کا خیال یک قلم محو ہو گیا۔

چار سال گذر گئے اور ایکا ایکی، تاثیر ہنستے بولتے دُنیا سے اُٹھ گئے، علم کی مجالس، شعر و ادب کی محفلیں، احباب کی دنیا سونی ہو گئی اور اس سونے پن ہی سے خیال آیا کہ آخر صاحبِ مکتوب کی عائد کردہ شرط بھی پوری ہو گئی۔ اس لئے مکاتیب کی اشاعت ہونی ہی چاہیئے۔ اس مسوّدے کی بازیابی ایک کرمفرما کی عنایت ہے، اور ان کی اشاعت تاثیر کی بے پناہ شخصیّت پر روشنی ڈالنے کے لئے ازبس اہم ؛

کیمبرج

۱۵؍ جنوری ۱۹۳۴ء

عزیزم۔ السلام علیکم۔ اب کے ڈاک یہاں بدھ کی بجائے جمعہ کو پہنچی۔ اور میری غیر حاضری میں جب میں یونیورسٹی لائبریری میں سرگرداں تھا۔ اب چائے پینے آیا ہوں اور آتے ہی مصروفِ تحریر ہوں۔ اس مرتبہ لاہور سے جو خط آیا ہے طوفانی۔ [ا] تو احباب عجیب غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اچھا وہ نیتوں کا مالک خدا سب کو صحیح اجر دیگا۔ مجھے تم سے فقط ایک بات کہنی ہے اور وہ یہ کہ تمہارا استاد، تمہارا دوست اور تمہارا بڑا بھائی "تاثیر" غلط بخشی کر سکتا ہے مگر دوست کی خاطر غلطی کر سکتا ہے مگر بخلوصِ تمام۔

میں محض اُداس نہیں۔ بے حد اُداس رہتا ہوں۔ تم لندن آئے اور یہاں چند ماہ کے قیام کے بعد بھاگ نکلے۔ اس وقت تمہاری اس حرکت

پر جہالت کا یقین ہوتا تھا لیکن اس "فرار" کی حقیقت اب سمجھ میں آئی ہے۔
پر عمر، آرام کی زندگی اور یوں پردیس میں مارا مارا پھرنا۔۔۔۔۔۔ تم نے
بہت اچھا کیا جو چلے گئے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں اگر اب آجاؤ تو بہت اچھا
ہو۔ اب بات بالکل مختلف ہو گی۔ میرے گذشتہ خطوں سے سب کچھ
واضح ہو چکا ہو گا۔ بھائی اگر انسانوں کی طرح رہنے کا عہد کرتے ہو تو چلو
آٹھ ہزار روپے میں تمہارے ٹرائی پوس کا میں ٹھیکہ کرتا ہوں بشرطیکہ
تم میرے کہے پر چلو اور لاہور کی "نوابی" کو چند ماہ کے لئے بھول جانے
کا یقین دلاؤ۔ لو اب فیصلہ کرو اور بتاؤ۔۔۔۔۔۔ ہاں یا نہ !

میرے خطوں میں تضاد کہیں نہیں۔ عجلت تمہاری زندگی کا جوہر ہے۔
بلکہ بہت سے لوگ تو تمہیں تمہاری جلدی اور جلد بازی ہی کی بنا پر جانتے
ہیں سو تم نے میرے خط عجلت میں دیکھے ہوں گے، ورنہ حقیقت یہ ہے
کہ میرا نگران اور ہے اور ٹیوٹر اور۔۔۔۔۔۔ ٹیوٹر دو ہیں ایک سینئر اور ایک
اسسٹنٹ۔ یہ میرے کام ہی کے نہیں بلکہ میرے جسم و روح کے بھی محافظ
ہیں۔ نگران کا نام تو شاید تم نے پہلے سے سُن رکھا ہو گا۔ سر آرتھر کو لرج کو
[۲] فی الحال ان سے گانٹھ رکھی ہے۔ لہٰذا ڈنر، بریکفاسٹ
لنچ، چائے سب کچھ ایک ایک بار مفت مل سکتا ہے۔ مگر فقط ایک بار
۔۔۔۔۔۔ آذری [۳] کہیں ہر بار سمجھ کر کوچ صاحب کے دو لنگ سے

کی طرف کوچ نہ کر دے! ہاں بھئی آذری کی شادی کے لئے سہرا مکمل کرنا محال ہو رہا ہے۔ تمہارے خوف سے اضطراب میں دو شعر لکھے ہیں جنھیں قطعہ سمجھ لو۔

اس مصیبت میں کسی کام تو آئے سہرا
بُزِ اخفش کی طرح سر نہ ہلائے سہرا
بھاگ جائیں نہ براتی کہیں ڈر کے مارے
آئے نوشاہ کے چہرے کو چھپائے سہرا

یہاں سردی غیر معمولی طور پہ کم ہے۔ تم تو لندن سے سردی ہی کے خوف سے بھاگے تھے۔ مگر اتفاق دیکھو کہ میرے آتے ہی موسم خوشگوار ہو گیا ہے۔ کئی دن تو موسم بہار کے سے ہوتے ہیں۔ برف باری تو ایک دن نہیں ہوئی۔ حرارت تیس چالیس ڈگری کے درمیان۔ ایک دن دریا جم گیا تھا۔ میرا مکان عین دریا کے کنارے ہے۔ بڑا دلفریب منظر تھا۔

جب میں یہاں لوگوں سے کہتا ہوں کہ انگلستان کی سردی یونہی ہوّا بنائی گئی ہے تو وہ جھنجلاتے ہیں۔ حالات میرے حق میں ہیں اور واقعات اُن کے۔ خیر اِس قصے کو چھوڑو۔ آؤ اب آپس کی باتیں کریں۔ تمہارے خط طویل، گپ بازانہ، مبالغہ آمیز میرے لئے آیۂ رحمت ہیں۔ میں نے یہ الفاظ سوچ سمجھ کر لکھے ہیں شاعری نہیں کی ——— ہائے کیا چیز

غریب الوطنی ہوتی ہے " بھئی کسی نے ٹھیک کہا ہے۔ لیکن تمہارے خطوں سے مجھے دلی تسکین ہوتی ہے۔ ہر شخص کی پوری تفصیل معلوم ہو جاتی ہے اور یوں میں زمان و مکان کی بندشوں سے آزاد ہو کر اسی مجلس میں چلا آتا ہوں جہاں تم لوگوں کے قہقہے گونجتے ہیں۔ پھر تم ہی کہو اب مجھے تمہارے خطوں کی قدر کیوں نہ ہو۔ برخوردار جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو خدا کرے تمہارے سارے تجربات میری طرح کے نہ ہوں۔ مجھے وفا کے بھی ثبوت ملے ہیں اور بے وفائی کے بھی۔ اور مایوسی اور قنوطیت کے لمحے پردیس میں زیادہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا بے وفائیاں زیادہ دُکھ دیتی ہیں اور وفائیں زیادہ آرام۔ تو اب وعدہ کرو کہ تم کوئی ڈاک ناغہ نہیں کرو گے۔ اس میں چوک نہ ہونی چاہیئے ورنہ مجھے رنج ہو گا۔

ہاں بھئی بزم [م] کے جلسوں میں میرا نام بھی شامل کر دو۔ انشاءاللہ مضمون لکھ کر بھیجوں گا۔ مگر چھٹیوں میں ہو سکے گا۔ آج کل کام کا بے طرح زور ہے۔ اڈّا جما رہا ہوں۔ تم سینما کو پوچھ رہے ہو یہاں مرنے کی فرصت نہیں۔ اس سال ہندوستان آنا بھی خواب و خیال ہے۔ میرے ذمہ بہت کام ہے۔ اتنا کہ تم سب کی دعا کی ضرورت ہے، کہ بطریقِ احسن سرانجام ہو۔ ابتدائی مرحلے تو بخیر و عافیت گذر گئے ہیں آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

ہاں وہ میرا مصوری والا مضمون "اولاً" نامکمل ہے۔ اور پھر اس

کی جو نقل سلطان مقصود [۵] کے پاس ہے وہ نامکمل تھی۔ اُس سے
بات نہیں بنے گی۔ اگر مقصود وہ مضمون مجھے دکھا سکتا تو شاید میں
ترمیم و تنسیخ سے اُس میں ربط و تسلسل پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر
وہ اُن "سعادتمند" شاگردوں میں سے ہے جو استاد کی ہر تحریر کو تبرک
سمجھ کر جزدان میں لپیٹ کر رکھتے ہیں۔ باہر کی ہوا تو کیا خود استاد کی
نظر بھی اُس پر دوبارہ پڑنے نہیں دیتے۔ لیکن اگر وہ اُسے بزم کے
مضامین میں شامل کرنے کے قابل سمجھتا ہے تو بہت اچھا بھئی۔ جو تم
سب کی مرضی۔ مجھے اس موضوع پر مقصود کی رائے پر اعتماد ہے۔

لو اب خط بند کرتا ہوں۔ اِس لئے کہ ڈاک کا وقت ہو چکا ہے اور مجھے
ابھی چائے بھی زہر مار کرنی ہے۔

والسلام
مخلص تاثیر

کیمبرج

۲۳ جنوری ۱۹۳۴ء

عزیزم ۔ السلام علیکم ۔ آج شام چند دوستوں کے ہمراہ دریا کی سیر کا ارادہ تھا۔ سیر کو نکلا تو اتفاق سے کالج کے متعلق ایک بات یاد آگئی وہاں پہنچا تو تمہارا خط ملا ۔ ٹیوشن فیس کا جرمانہ تھا اس لئے گھر کے پتے پر کالج والوں نے نہیں بھیجا تھا ۔ جرمانے کی تو کوئی بات نہیں لیکن اگر میں اتفاق سے کالج نہ جاتا تو یہ خط رہ جاتا۔ اور تمہارا خط ! ــــــ بھائی ٹکٹ خرید کر گھر رکھو۔ تمہیں تو اتوار کے بعد اتنے دن مل جاتے ہیں یعنی اتوار کو ڈاک آتی ہے اور تم بدھ تک جواب دے سکتے ہو لیکن مجھے جمعرات کو خط ملتے ہیں اور جمعہ کو جواب ارسال کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے اگر کبھی جواب مختصر ہو تو اسے ردِ عمل نہ سمجھا کرو۔ مجبوری، معذوری، ناچاری ہوتی ہے۔ میں اتنا نازک مزاج نہیں کہ طویل خط لکھنے میں انگلیوں کے فگار ہونے کا خوف ہو۔

سعید اللہ [۶] اور عبدالواحد [۷] کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی ۔ نہ جانے وہ کس بنا پر تمہیں ایم ۔ اے میں اُلجھے رہنے کی تلقین کر رہے ہیں ۔ حالانکہ بی ۔ اے ٹرائیپوس کے سامنے تمہارے ہاں کے ایم ۔ اے کی حیثیت کچھ نہیں ۔ اور پھر اگر ایم اے کی دُم ہی ساتھ لگانے کا شوق ہے تو گھبراتے کیوں ہو تین سال میں یہ دُم خود بخود اُگ آتی ہے ۔ پچھلے سال تمہیں بی ۔ اے میں تھرڈ کلاس ملا ۔ شرم کی بات تھی لیکن ہم یہ بہانہ کر سکتے ہیں کہ بی اے کے تین مضامین میں سے تم تاریخ میں زیادہ مشغول رہے لہذا انگریزی اور معاشیات کا معاملہ چوپٹ ہو گیا اور نتیجہ غیر تسلی بخش رہا ۔ یہ منطق یہاں سب کی سمجھ میں آسکتی ہے لیکن اگلے سال جب تم نے ایم اے بھی تھرڈ کلاس ہی کیا تو بھائی یہاں تمہیں کوئی گھسنے نہیں دے گا اور اُس وقت کوئی معذرت بھی قابل پذیرائی نہ ہو گی ۔ سو وقت ضائع نہ کرو ۔ اور فوراً آؤ ۔ میں نے ہر کالج سے مایوس ہو کر اب فٹز ولیم والوں سے یہ وعدہ لیا ہے کہ اگر دو ہفتوں کے اندر اندر تمہاری عرضی آگئی تو وہ غور کر لیں گے ۔ یعنی اگر تم نے اس خط کے پڑھتے ہی ہوائی ڈاک میں بڑی پُر زور سفارشیں بھجوا دیں تو ! —— بھائی تم تھرڈ کلاس ہو ! —— سعید اللہ کو میں نے پچھلے ہفتے سندات کا مضمون لکھ بھیجا ہے ۔ حمید احمد خاں [۸] تمہارے ٹیوٹر ہیں گو دونوں FOSSILS

ہیں اور آسانی سے کسی کی بات نہیں سمجھتے مگر ان کو یقین دلاؤ کہ تمہارا یہاں چلے آنا تمہارے حق میں کئی مفید نتائج کا حامل ہوگا۔ آگے تمہاری مرضی۔ میری خاطر عرضی بھیج کر بعد میں نہ آنا مجھ سے دشمنی کرنا ہوگا۔ "نہیں" کر دینا فقط اپنے آپ سے دشمنی کرنا ہوگا۔ بہرحال تم میرے جذبات سے بے پروا ہو کر قطعی فیصلہ کرو۔

میں نے تمہارا مضمون [۹] دیکھا۔ اسے چھپنا نہیں چاہیئے تھا۔ گو تم کہہ سکتے ہو کہ اُس پر تمہارا نام نہیں ہے مگر برخوردار مضامین میں تحریراً ایسی باتوں کا تذکرہ ذلت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اس سے آلودہ ہو۔ ہرگز نہیں۔ نجاست سے کھیلنا بھی نجس کام ہے جس کی میں تم کو اجازت نہیں دیتا۔ تمہاری تنقید کو تنقیص نہیں ہونا چاہیئے۔ حریف، بدلہ بنو حریف، دشنام نہیں۔ ہرگز نہیں، مجھے تمہاری — بقول پرتاپ: "اس اخلاقی گراوٹ" سے شرمندگی ہوئی۔ ادبی حملہ کرنا شاید کوئی جرم نہیں بشرطیکہ اُس سے نیت محض مضمون کی وضاحت ہو لیکن ادبی حملے میں شرافت کو ہاتھ سے دینا ایسا جرم ہے جسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر برخوردار دشنام بدشنام کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ اس میں لذت ہی کیا ہے؟

اس وقت چھ بجے ہیں۔ میں کمرے میں آگ کے شعلوں کے سامنے

بیٹھا ہُوا تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اس سلسلے کو ختم کرنے کو جی نہیں چاہتا
لیکن لائبریری کی چند کتابیں فوراً لوٹانا ہیں۔ اگر آج وہ ختم نہ ہوئیں
تو پھر اُن کے پڑھنے کی باری دیر سے آئے گی۔ اس مجبوری کے پیشِ
نظر یہ خط یہیں بند کرتا ہوں۔ والسّلام

مخلص تاثیر

کیمبرج

۳۱ جنوری ۱۹۳۴ء

عزیزم - السلام علیکم - آج کا سارا دن تمہاری سہل انگاری کی نذر ہوا - تمہارا خط نہیں ملا - کئی مرتبہ پوچھ چکا ہوں - نہ جانے تمہیں آج کل کونسی مصروفیات ہیں خط تم نہیں لکھ سکتے - اپنے مستقبل کے متعلق فیصلہ تم نہیں کر سکتے -

تمہارا داخلہ قریباً ناممکن ہو گیا ہے - لیکن اگر جلدی کرو تو شاید حالات مساعدت کریں - خدارا ہوش کرو - دو خالی فارم بھیج رہا ہوں - میں نے پنسل سے خانہ پری کر دی ہے ان پر اپنے ہاتھ سے تفصیلات درج کر دو - اور بذریعہ ہوائی جہاز مجھے بھیج دو - عبدالواحد کو میں نے علیحدہ خط میں تمہاری سندات کے متعلق ہدایات لکھدی ہیں ان سے مل کر اپنے سرٹیفکیٹ فوراً ڈرافٹ کرالو - جھٹ کر آج ہی - ابھی -

اب بیرسٹری کی سن لو - کورس بارہ ٹرموں کا ہے - سال میں چار

ہوتی ہیں۔ گویا معمولی حالات میں تین سال کی مدت درکار ہے۔ اور عام طور پہ بار لوگ تین سال ہی میں سند حاصل کرتے ہیں۔ مگر کورس کے دو حصّے ہوتے ہیں چھ چھ ٹرموں کے۔ گویا اگر پہلا حصّہ طے کر لو تو دوسرے حصّے کی چھ ٹرموں کو بعد میں طے کیا جا سکتا ہے۔ گویا پہلی چھ ٹرمیں تو لازمی ہیں لیکن اگر پہلے حصّے میں محنت سے کام لیا ہو، استاد خوش ہوں اور دوسرے حصّے کو بہت جلد طے کر لینے کی ہمّت ہو تو سال بھر کی معافی بصد حیلہ و بہانہ مل سکتی ہے۔ گویا اگر دوڑ دھوپ کی جا سکے تو شاید دو سال میں کام بن جائے۔ بیرسٹری کا بھی اور ٹرائپوس کا بھی۔ لیکن شرط بہت کڑی ہے۔ محنت! حرام خوری کے ارادے ہوں تو پھر وہیں پڑے رہو۔ مگر تم کچھ عرصے سے حساب کتاب کے متعلق کچھ ضرورت سے زیادہ ہی متفکر نظر آتے ہو۔ یہ اچھی علامت ہے اور نیک شگون۔ میں خوش ہوں کہ تمہیں روپے کی قدر ہوئی۔ لیکن اللہ پر توکّل کرنا بھی سیکھو۔ ہاں اگر تم کو اس پر بھروسہ نہیں رہا تو بات دوسری ہے۔ اپنی زندگی کو سادہ بناؤ۔ ابتدا میں تم نے کالج میں فضول خرچی کے خاصے خطرناک مظاہرے کئے۔ لیکن انہیں معاف کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس عمر میں ظاہری نمائش پہ کون جان نہیں دیتا مگر اب تمہارے خیالات میں پختگی آنی چاہیئے۔ اس لئے اپنی ضروریات میں سادگی اختیار کرو۔ آرام رہے گا۔

فروغِ اُردو [۱۰] کی کتابوں کے متعلق دوبارہ اور آخری تاکید ہے
کہ فوراً بھجواؤ۔ چھپی ہوئی کتابوں پر ہندوستان سے انگلستان تک محصول
ڈاک ہر دو اونس یا اس کے کسی حصے پر پون آنہ لگتا ہے کم از کم ۱۹۴۳ء
میں تو یہی تھا ہاں اگر میرے آنے کے بعد وہاں حکومت بدل گئی ہے تو بات
دوسری ہے۔ میرے حساب سے اگر تم چھ سیر وزنی کتابیں بھیجو تو ان پر تین روپے
کچھ آنے خرچ آئے گا ---- مجھے تو یہی حساب آتا ہے مگر تم ہو کہ سینکڑوں
اور پچاسوں میں باتیں کرتے ہو۔ تمہاری مبالغہ آمیزی اور ہنگامہ خیزی نہ
گئی۔ گھر بیٹھے تخمینے لگا لیتے ہو۔ تمہارے ہاں ٹیلیفون موجود ہے خود چل کر
جانے کی بھی ضرورت نہیں فون ہی پر رام کرشنا یا ڈاکخانے والوں سے
پوری معلومات مل سکتی ہیں۔ مگر تم ہمیشہ اپنے اندازوں پر بھروسہ کرتے ہو۔

فقط والسلام

مخلص ناشر

کیمبرج

۶ر فروری ۱۹۳۴ء

عزیزم - السلام علیکم - تمہارا خط ملا - اطمینان بخش تفصیلات تھیں - اس سے بہت سی باتوں کے متعلق تسلی ہو گئی - شکر ہے کہ تم فروغ اردو کی کتابیں بھجوانے کا عزم کر چکے ہو - امید ہے آئندہ بحری ڈاک سے تم کتابیں بھیجو گے - تمہارے آنے کے متعلق معلوم ہوا کہ تم آمادہ ہو گئے ہو کہ وطن کو کچھ عرصے کے لئے خیرباد کہہ دو - ماقبل لکھ چکا ہوں پھر سن لو - ایک سال آٹھ ماہ لگیں گے عام لڑکوں کا یہی حال ہے - بیرسٹری کے متعلق یہ عرض ہے کہ اگر محنت کر سکو تو ۲ سال میں ہو سکتی ہے ساتھ ہی - لیکن میں تمہارے ٹرائپوس کے بعد ملازمت کی ضمانت نہیں کرتا - بیرسٹری کے بعد آمدنی کی ضمانت کی طرح - خیر اب صورتِ حالات یہ ہے کہ فارم بھر کر حسبِ ہدایت فوراً بھیجو - آگے مرضیٔ مولا - لیکن خدارا لیت و لعل چھوڑ دو - معاشقہ ٹھیک ہے مگر تمہاری زندگی کا بہتر حصہ ابھی تمہارے سامنے ہے اور یہ بہتر حصہ بلکہ بہترین

ہوتا ہے کیونکہ ذمہ داریوں کا بوجھ زندگی کو افسردہ بنا دیتا ہے۔ ہوش کرو، سنبھلو۔

لو اب ختم کرتا ہوں لیکن پھر سن لو۔ تم ضرور آؤ خواہ کسی قسم کی قربانی ہی کرنا پڑے۔ ابھی وقت ہے۔ مجھے ہندوستان میں رہ کر تمہارا مستقبل تاریک سا نظر آتا ہے۔ تم یہاں آؤ۔ گو میں تمہاری بےقراریوں کا قرار واقعی علاج نہیں کر سکتا مگر بہلاتا رہوں گا۔ مل کر رہ لیا کریں گے۔

لو اب تو خوش ہو۔ فقط والسلام

مخلص تاثیر

کیمبرج

۱۲، فروری ۱۹۳۴ء

عزیزم۔ السّلام علیکم۔ برف باری، زکام، کھانسی، کثرتِ کار، اُداسی، پھر بھی کاسموپالیٹین جانا پڑا۔ مختلف چیزیں تھیں۔ مگر ایک رنگوں اور شعاعوں کا "آہنگ" اور ایک سیاہ یک رخی "نیرنگ" خوب تھے۔ پھر ایک فرانسیسی طربیہ میں منظر کی تزئین کا نیا انداز دیکھنے میں آیا۔ بالکل چینیوں کی ریشمیں پارچے کی مصوّری کی طرح تھا۔ ایک مقام کی نمائش کے بعد اُس کے چاروں طرف کے منظر کو گھما کر دکھا دیا۔ لیکن حرکات وسکنات میں یک آہنگی کو برقرار رکھتے ہوئے۔ کاش تم اس شو میں موجود ہوتے۔ یہاں آکر فلم پر اپنی کتاب کو مکمل کرو تو بے نظیر چیز ہو۔ اور یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ تعلیم کے لئے نہیں آنا چاہتے تو شادی کرا کر ہنی مون کے بہانے چلے آؤ۔ خرچ کا اندازہ صحیح صحیح ہر خط میں لکھتا ہوں لوگ تو قرض اُدھار کر کے چلے آتے ہیں۔ تم بیوی سے

لے لو۔ مگر بھائی زندگی برباد نہ کرو۔ چلے آؤ۔ نہیں ساری عمر پچھتاؤ گے۔
مجھے تار کے ذریعے اطلاع دو کہ تم کب آ رہے ہو۔ وقت بہت تنگ ہے
اور تمہارا ڈویژن تھرڈ ہے۔ یہاں اس پر بہت غور کیا جاتا ہے۔

ہاں تو وہ شعاعوں کا کھیل حیرت انگیز تماشا تھا۔ آسمانی رنگ
کے ارغنیہ یعنی بیک گراؤنڈ میں ایک طرف سرخ رنگ پھوٹ رہے تھے
چند شعاعی نقطے ——— لمعاتِ ضو ——— ناچنا شروع کر دیتے
ہیں جس طرح کمرہ میں ذرّے ناچتے ہیں۔ یوں دکھائی دیتا تھا گویا کسی
گلبدن تلیتری کے ریشمیں پروں پر بنارسی سلمے کا کام کیا ہوا ہو۔
پھر یہ مستطیل شکلیں لمبی ہو کر ویسی ہی خوبصورت لکیریں بن جاتی تھیں
جیسے چغتائی کی تصاویر میں انگلیاں۔ یا پوٹھوہاری سنہری جوتے کی نوکیں۔
تم بھی ہوا میں ہاتھ سے موسیقی کی لے کی نقل اتارتے ہو گے۔ گانے والوں
کو پلٹوں اور زمزموں کے ساتھ ہاتھ اور بدن ہلاتے دیکھا ہو گا۔ ورنہ
پنجاب پولیس کے بینڈ کے کنڈکٹر کو چھڑی سے موسیقی کے اتار چڑھاؤ
کی شکلیں بناتے لارنس گارڈن میں جا کر اب دیکھ لو۔ سو یہ مہتابی سانپ
بل کھولتے ہوئے ایک سے دو اور دو سے بیسیوں بنتے جاتے ہیں
اور سازوں کی موسیقی ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہے۔ عجیب ہیجان کا مجموعہ
تھا۔ شاید تم میرے الفاظ پر ہنس رہے ہو۔ خدا کرے یہ انتے کوتاہ نہ

ہوں کہ تم کو ان کے مفہوم پر حیرت ہو۔

اچھا اگر یہ سمجھ میں نہیں آیا تو گریٹا گاربو کی کوئین کرسٹینا کے متعلق کیا خیال ہے۔ خاصی ٹریجڈی ہے۔ خلاصے اور ساکت تصویریں تو تم نے دیکھ لی ہوں گی۔ یہاں بہت مقبول ہو رہا ہے۔ اس سویڈش تاریخی حکایت کی جملہ خصوصیات اور افسانے کا انداز "ہنری ہشتم کی خفیہ زندگی" کی قسم کا ہے۔ لیکن اس کی مجموعی کیفیت اس سے بدرجہا بہتر ہے، اس کے مناظر جن کا تعلق قطعی طور پر سویڈن کے تاریخی ماحول سے ہے، حیرت خیز ہیں۔ تصویر کے بعض مقامات پر وہ جو افسانوں کے اندر متعدد مرتبہ دکھلائے گئے ہیں۔ اگر تصویر دیکھو تو ان پر ضرور غور کرنا۔ انہیں تم اس قدر واضح اور نئے انداز میں پاؤ گے کہ غالباً سینما کی تاریخ میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی شے نظر آئیں۔

اچھا تو تم کب آ رہے ہو۔ بھائی میں یہاں بے دست و پا ہو رہا ہوں۔ ادھر تھیسس کا کام اتنا بڑھ گیا ہے کہ الامان۔ اُدھر غیر مُلک۔ ساتھی سب مُلّانے یا فرنگی۔ اور "غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد"۔ تم وہاں زندگی کیوں برباد کر رہے ہو۔ چلے آؤ۔ تم اپنی سینما والی [۱] کتاب کے متعلق مشورے مانگ رہے ہو۔ بھئی تھوڑے بہت تو عرض کر چکا ہوں لیکن میں اس معاملے میں بے بہرہ ہوں۔ کم از کم تمہارے معاملے

ہیں تم خود سوچ سکتے ہو میں کس قدر بے بہرہ ہوں۔ سعید اللہ کو یہ فقرہ سنانا۔ کہے گا تاثیر بول رہا ہے مگر تاثیر بالکل وہی نہیں رہا۔ اداس، خاموش، محنتی۔ یادوں کا ستایا ہوا تاثیر وہ نہیں رہا۔ میرا جی چاہتا ہے میں اڑ کر لاہور پہنچوں۔ میں نے سعید اللہ اور ابوالاثر [۱۲] دونوں کو لکھا ہے کہ وہ یہاں نہ آئیں۔ حفیظ کبھی نہیں۔ اور سعید اللہ ابھی نہیں۔ مگر میں تمہیں کہتا ہوں کہ فوراً چلے آؤ۔ حفیظ آیا تو مجھے خوشی ہو گی مگر اس کا بے فائدہ نقصان ہو گا سعید اللہ آیا تو مجھے خوشی ہو گی مگر میں اس کے ساتھ سیر و سیاحت کو نہ نکل سکوں گا۔ تم آئے تو مجھے خوشی ہو گی اس لئے کہ تم نے ایک نیک صلاح مانی

تمہاری [۱۳] اُردو ادب کی تاریخ کے متعلق میں تمہیں مشورے بھیج چکا ہوں۔ میرا بنایا ہوا نقشہ ذہن میں رکھو۔ اور احباب سے مشورہ کر کے ایک ڈھانچہ تیار کرو، ابواب، ماخذ، مواد، زاویۂ نظر اور موضوعات کے متعلق۔ پھر یہ ڈھانچہ مجھے بھیجدو۔ میں اس میں ترمیم یا تنسیخ کر کے واپس کر دوں تو اپنا کام شروع کر دو۔ مگر دیکھو ڈھانچہ مرتب کئے بغیر یونہی اندھا دھند نہ چلنا۔ کاش تم یہاں ہوتے تو یہ کام یوں ہوتا جیسے چٹکی بجاتے ہیں۔ بہرحال تم کام شروع کر دو۔ گو یہ آسان بات نہیں لیکن ہمت کرو تو کوئی ایسی مشکل بھی نہیں۔ آزاد، شیفتہ، عبدالسلام، امداد امام اور

جعفر بلگرامی یہ پانچ تذکرے تمہارے دیکھے ہوئے ہیں اور سکسینہ کی تاریخ، حالی کا مقدمہ، شبلی کا موازنہ، عبدالحق کے مقدمات، عبداللطیف کی کتابیں تمہارے مطالعے میں رہی ہیں۔ نیز متقدمین کی نثر کے متعلق ہاشمی کے مقالات، رسالہ "اردو" کے مضامین اور محمود شیرانی کی "پنجاب میں اردو" یہ سب تم نے غور سے پڑھے ہوئے ہیں۔ رہ گئیں انگریزی کی کتابیں تو ادبی تنقید پر ..... مگر تم نے ابھی ڈھانچہ تو مرتب نہیں کیا اور میں نے ابھی سے مشورے شروع کر دیئے۔ حالانکہ مجھے چاہیئے کہ تمہارے خاکے کو دیکھنے کے بعد مشورہ دوں۔

لہذا فقط والسلام

مخلص تاثیر

کیمبرج
۲۰ فروری ۱۹۳۴ء

عزیزم - السلام علیکم - ابھی ابھی بریکفاسٹ کھایا ہے ساڑھے دس بجے - آج ذرا دیر ہو گئی ہے - پونے بارہ بجے سپروائزر کے پاس جاؤں گا - وہاں سے کالج اور پھر لائبریری - سوا چار بجے گھر - پھر مطالعہ اور کچھ لکھائی - ساڑھے سات بجے شام کا کھانا - آٹھ بجے سیر - نو دس بجے واپسی - پھر گھنٹہ بھر مطالعہ پھر نیند اِس امید پر کہ شاید گھر خواب میں نظر آ جائے - پھر صبح سویرے بیداری اور ہوائی قلعے اور خیالی پلاؤ - آخر اخبار، شیو، غسل، ناشتہ اور پھر وہی چکر - بیچ میں کبھی کبھی نماز - اور تلاوتِ کلامِ پاک ——— جی ہاں نماز اور تلاوت ——— اتقاء کے اظہار کے لئے نہیں بلکہ اطمینانِ قلب کی خاطر ——— بس یہ ہے، رات دن کا پروگرام - ایک دن تمہارے لندن کی دوبارہ زیارت کا اتفاق ہوا - اُف کس قدر ناپاک جگہ ہے - مجھے کچھ کتاب بازی کرنا

تھی۔ خدا خدا کر کے واپس آیا بغیر سینما تھیٹر گئے۔ البتہ پلاؤ کھایا تھا طبیعت ابھی تک دق ہے —— توبہ!

آج سورج چمک رہا ہے۔ مگر چاند کی طرح روشن ہے مگر بے حرارت۔ ہاں آنکھیں خوش ہیں —— مگر ہائے لاہور، پسینہ، گرمی۔ پیاس مگر ہائے لاہور ——

ابھی ابھی ایک دوست کے ذریعے اطلاع ملی ہے کہ نئے سال کیلئے ۸۵۴ ہندوستانیوں کی درخواستیں زیر غور ہیں مگر صرف چالیس لئے جائیں گے۔ کیمبرج میں۔ لہٰذا تم بذریعہ کیبل اپنے ارادے سے مجھے مطلع کرو۔ لیکن یہ یاد رہے کہ یہ فیصلہ آخری ہوگا۔ ہاں کے بعد نہیں کا امکان نہیں۔ پھر سُن لو یہاں عام شریف آدمی کا خرچ اس وقت تین سے چار پاؤنڈ مہینہ ہے۔ پڑھائی کا نوّے پاؤنڈ سالانہ۔ میعاد اٹھارہ ماہ۔ کپڑوں پر خرچ غیر ضروری یا حسبِ توفیق۔ البتہ کتابوں کی ضرورت مقدم ہے۔ بہرحال شریف آدمی آٹھ ہزار صرف کرتا ہے تم نو ساڑھے نو تک بڑھ جاؤ۔ لیکن اس سے آگے قدم پھیلاؤ تو میرا اسراف جہالت کی نشانی اور حماقت کا ثبوت ہے۔ تم مجھے اپنے ارادے سے مطلع کرو تو میں ریشہ دوانیاں شروع کر دوں۔

کل میں پڑھ نہیں سکا۔ آپ حضرات کی طفیل —— تمہارے نام

۲۲ عدد کتابیں بلیسر نہ ہیفر اینڈ سنز کی معرفت بھیجی ہیں - ان میں تو اسلامیہ کالج لائبریری کی ہیں غلام حسین کو دے دو - ایک گورنمنٹ کالج لائبریری کی ہے تبسم [۱۴] کو دے دو - بارہ آپ حضرات کیلئے ہیں - عید کے تحائف ہیں -

اوپر کی چار کتابیں نظم کی ہیں - دو آذری کے لئے اور دو طارق [۱۵] کے لئے - اس انتخاب کی مختلف وجوہ ہیں آذری شعر کہتا ہے اور طارق شعر کا دلدادہ ہے - براؤن کے جو دو تراجم فارسی شاعروں کے ہیں ایک بشیر [۱۶] کے لئے اور ایک ناظم کے لئے ——— وجہ؟ بشیر فارسی کا طالبعلم ہے اور ناظم عجمی مذاق رکھتا ہے - ایک کتاب اسلامک آرکیٹیکچر پر ہے - ظاہر ہے سلطان مقصود کے لئے ہوگی - ماہر جمالیات جو ٹھہرا - بی بی سی کے جو پمفلٹ ہیں وہ تمہارے مطالعے کے لئے ہیں - دو کتابیں سینما کے متعلق بھی تمہارے لئے ہیں - یہ تازہ ترین مطبوعات ہیں - خدا تمہارے کام کو ٹھکانے لگائے - یہاں سے دعا ہی دے سکتا ہوں - کتاب احتیاط سے چھاپنا - تمہاری پہلی کتاب ہوگی - مجھے امید ہے کہ کتابوں کا مقابلہ قیمت کے اعتبار سے نہ کیا جائیگا - میں نے کوشش کی ہے کہ ہر آدمی کو اس کے ڈھب کی چیز ملے - یہ انبار کل روانہ ہوگا - اور مجھے امید ہے کہ عید سے پہلے مل

جائے گا۔ میں متمنی ہوں کہ عید کی نماز کے بعد میرے لئے دعائے خیر کی جائے۔
——— میں خود اب کے عید کا فریضہ لندن میں ادا کروں گا۔ اور تم سب کے حق میں دعا کرونگا۔

"ہاں بھئی" "کارواں" پڑھا۔ خوب چیز ہے۔ کئی اعتبار سے پہلی جلد سے اچھا ہے۔ مگر یہ کیا وحشت ہے کہ عزیز۔ جلیل اور ناطق کے نام سے جو غزلیں ہیں وہ اُن کی نہیں۔ بخاری کا مضمون یوپی والوں کے نام امتیاز کے کھیل اور حفیظ کے گیت خاص چیزیں ہیں۔ تصویروں کا انتخاب بھی اچھا ہے۔ بحیثیت مجموعی سارا پرچہ کامیاب ہے۔

فقط والسلام

مخلص تاثیر

کیمبرج
یکم مارچ سنہ ۱۹۳۴

عزیزم - السّلام علیکم - ہیفرد لے کل نہیں آئے - تمہاری کتابوں کے پارسل لندن سے آج رات نو بجے روانہ ہونے چاہیں تھے یہاں سے آج بارہ بجے نکل جاتے تو ڈاک میں شامل ہو سکتے - مگر ہیفر والوں کی گاڑی نہیں آئی - اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ڈاک خالی گئی - عید ۲۷ مارچ کو ہے - نظر آتا ہے کہ اب عید ہی کے روز تمہیں کتابیں ملیں گی -

میں تمہیں اپنے ہر خط میں یہاں کے دلچسپ اخباری معاملات کے متعلق تراشے بھیجا کرتا ہوں - اس امید پر کہ وہ تمہاری دلچسپی کا موجب ہوں گے تم نے کبھی ان کی رسید تک نہیں دی - آج ایک اور تراشا لو - تم نے "ہندو ہیون" پڑھی تھی نا - وہی فورمین کالج کے ایک سابق امریکی استاد کا لکھا ہوا ناول - یہ کتاب پہلے پہل امریکہ میں طبع

ہوئی تھی۔ اب یہاں انگلستان میں چھپی تو اس پر ڈیمونٹ مرلنسی گورنر پنجاب کے ایک سابق اے ڈی سی نے ہتک عزت کا دعوے کیا۔ اس مقدمے میں بالآخر مصالحت ہو گئی مگر میں "ٹائمز" سے اس مقدمے کی روئیداد کا تراشا بھیجتا ہوں۔ پڑھنے کی چیز ہے۔

آذری کا ایک بحری ڈاک والا خط ملا۔ ناراض نظر آتا ہے کہ میں سب کو خط لکھتا ہوں لیکن اسے بھول گیا ہوں۔ یہ سوئے ظن گناہ ہے۔ اسی سے پوچھو کہ خود اس نے مجھے کتنے خط لکھے ہیں جن کا جواب نہ پانے پر وہ بزِ اخفش یوں سر ہلا رہا ہے۔ بھائی جو جو خط لکھے گا جواب لیتا جائے گا۔ خیر میں آج اُسے علیحدہ خط لکھ رہا ہوں۔ اس کا ناراض رہنا ٹھیک نہیں۔ آخر شاعر ہے کہیں جوش میں آ کر ہجو کہہ ڈالے تو میں یہاں سات سمندر پار سے "جوابِ آں غزل" کا انتظام کیسے کرونگا۔

حفیظ جالندھری رسالہ نکال رہا ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ اس معاملے میں دل و جان سے توجہ دو۔ آج ہی ماڈل ٹاؤن جاؤ۔ وہ بیمار ہے۔ تمہارے جانے سے اسے تسکین ہو گی۔ پنڈت جی [۱۷] بھی بیمار ہیں ان کی عیادت کو بھی نہیں جانا چاہیئے۔

یہاں عام لوگوں کے امتحانات شروع ہونے والے ہیں اور موسم بے حد خوشگوار ہے۔ موسم کا ذکر بار بار اس لئے کرتا

ہوں کہ یہاں جیسا کہ تم جانتے ہو، صبح و شام موسم ہی کا تذکرہ رہتا ہے۔ اور ہے بھی ظالم ایسا اہم اور ناقابلِ اعتبار کہ ہر وقت پیشِ نظر نہ رہے تو اور کیا ہو۔ شیکسپیئر کے فقرے Uncertain Glory of April کا صحیح مفہوم اب واضح ہوا ہے۔ لاہور میں تو آج کل بسنت کی تیاریاں ہوں گی۔ میلے ٹھیلے ہوں گے۔ سرسوں پھول رہی ہوگی اور موسمِ بہار کے آغاز کا دلفریب سماں ہوگا۔ خیر ان تصوّرات سے میں اپنا دل کیوں متوحش کروں۔ تم اپنا حال سناؤ۔ ہاں یہ تو کہو تم نے یہ "طلبِ دعا" کیوں کی ہے۔ شادی کب ہے؟۔ آتشِ شوق کا کیا حال ہے؟ کام کی بات تو تم لکھتے نہیں۔ یونہی آئیں بائیں شائیں کر دیتے ہو۔ بہت زور مارو گے تو اپنی طبیعت کی پریشانی کا تذکرہ شروع کر دو گے۔ گو میں اس پریشانی کے جملہ وجوہ بخوبی سمجھتا ہوں۔ مگر تم سے یہی کہونگا کہ عزیزمن گھبرایا نہ کرو۔ خدا کو تم سے بہت سے کام لینے ہیں۔ یہ نہ ہوتا تو تم کو اتنی صلاحیتیں نہ عطا فرماتا۔ مجھے تو تمہارا مستقبل درخشندہ نظر آرہا ہے لیکن تم بے آس ہو رہے ہو۔ تاریک وہموں میں گھرے رہنے کی بجائے گہرے خیالات میں ڈوبنے کی عادت ڈالو۔ کوئی مفید کام ذمہ لو۔ جبھی تو کہتا ہوں کہ یہاں آجاؤ۔ یہ مایوسی کیوں؟ دیکھو طارق کا بھی یہی حال ہے تمہیں افسوسناک دیکھ کر وہ بھی ایسا ہی ہو گیا ہے ایسے

مخلص بھائیوں کے ہوتے ہوئے ہمت ہارتا بزدلی نہیں تو کیا ہے۔ پھر میں بھی تمہارا بھائی ہوں ــــــــ تمہیں فکر کس بات کی ہے۔ محض جوانی کا زور دکھانے سے دنیا کے کام نہیں چلتے۔ تو لو وعدہ کرو کہ اگلی مرتبہ تم مطمئن اور مطمئن ساز خط لکھو گے۔ آذری کو سلام۔ یارانِ طریقت کو پیار۔ فقط والسلام

مخلص تاثیر

کیمبرج

۷، مارچ ۱۹۳۴ء

عزیزم۔ السلام علیکم۔ رات آٹھ بجے تک تمہاری ڈاک کی راہ دیکھتا رہا۔ نہیں پہنچی۔ آج امید لگ رہی ہے۔ رات جہانگیر خان [۱۸] ملانصادہ بھی تاکید کرتا ہے کہ داخلے کے متعلق ابھی سے قطعی فیصلہ کرلو۔ پھر ہم بے دست وپا ہوں گے ——— اور یہ کہ فیصلہ اثبات میں کرو۔ برخوردار میں جانتا ہوں تم کن تردّدات میں ہو۔ لیکن ایک سال پہلے ضائع کرچکے ہو۔ اب موقع ہے پھر داخلہ ممکن نہ ہوگا۔ تم جانو ——— "عالم دوبارہ نیست" تو پھر کیوں زندگی برباد کر رہے ہو۔ خرچ کی پروا نہ کرو۔ ایسی ایسی بچت کی راہیں بتاؤں گا کہ باید و شاید۔ اتنا سستا سودا شاید اور کہیں ممکن نہ ہو۔ میرے تجربے اور علم سے تمہیں فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ میں جب سال بھر تمہارے ہمراہ رہوں گا تو تم یقین جانو کہ ہزار کا خرچ آٹھ سو ہی میں پورا کردونگا۔ عزیزم بھائی۔

برخوردار۔ ہوش کرو۔ نکاح کر لو۔ قرضہ لے لو۔ ادھار مانگ لو۔ مگر چلے آؤ۔ شاید میں بھی اِس کارِ خیر میں شریک ہو سکوں۔ یہ باتیں میں اتمامِ حجت کے طور پر لکھ رہا ہوں ورنہ جانتا ہوں کہ روپے کا تمہیں اتنا خیال نہیں جتنا رومانس کا۔ بھائی وہ رومان بھی جاری رہ سکتا ہے ایک طریقہ بتاؤنگا۔ مگر تم آؤ تو۔

آج کتابیں روانہ ہو گئی ہیں ان مراسلات میں دو اضافے کئے ہیں۔ بشیر کو فارسی کی کتاب کے ترجمے کے ساتھ بی بی سی کی ایک کتاب اسکی کشیدہ کاری کی رعایت سے بھیج رہا ہوں چونکہ وہ کھلاڑی بھی ہے، اس لئے بوٹ ریس، پر ایک نفیس کتاب بھی حاضر ہے۔ ایک کتاب برخوردار صلاح الدین کے لئے میرے گھر پہنچا دو۔ اس بہانے کم از کم تم محلے کو تو دیکھ لوگے جہاں کبھی کبھی تم مجھ سے ملنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ وہاں اگر حکیم یوسف حسن سے اتفاقیہ مڈبھیڑ ہو جائے تو اُس نثر... کی ستائش ضرور کرنا جس کے طفیل انہوں نے اب تک "نیرنگِ خیال" نہیں بھیجا۔

لو ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ہندوستان کی ڈاک غیر معمولی طور پر رُک گئی ہے۔ حالانکہ یہ تاخیر اب ایک قسم کا معمول ہو گیا ہے اب جمعے کے دن پہنچے گی یہاں صبح کو۔ حالانکہ جمعہ ہی یہاں ڈاک کی روانگی کا

دن ہے۔ خدا جانے یہ راستے میں موسم آج کل خرابی پر اس طرح کمربستہ
کیوں ہے۔ یہاں بہار کی رُت شروع ہے۔ حرارت کل پچاس تک پہنچ
گئی تھی آج تو سورج میں بھی تمازت ہے۔ میں اپنے مکان کی کھڑکی کے
سامنے بیٹھا تمہیں خط لکھ رہا ہوں دور حدِ نظر تک دریا کے کنارے
قدم قدم پر کالجوں کے ہاؤس بوٹ ہیں اور ہر ایک پر مختلف جھنڈا لہرا
رہا ہے میرے مکان سے یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے اور دور تک چلا گیا
ہے۔ اس کمرے سے ٹرنٹی ہال کا جھنڈا نظر آ رہا ہے۔ سیاہ زمین پر
سفید ہلال ——— خوب چہل پہل ہے۔ ان دنوں کشتیوں کی دوڑ
کی طیاریاں زوروں پر ہیں، اُدھر کھیلوں کے مقابلے ہو رہے ہیں۔
فٹ بال الگ عروج پر ہے۔ کرکٹ کا موسم بھی عنقریب شروع
ہونے والا ہے۔ مگر ابھی سے آسٹریلیا کی ٹیم کی دھوم مچی ہوئی ہے۔
تمہارے لندن میں بھی نمائش ہو رہی ہے۔ غرضیکہ سب کچھ ہے لیکن
——— ہائے لاہور!

آذری کے بیاہ کی تاریخ نہ بتائی تم نے۔ عرصہ ہوا ایک قطعہ لکھا
تھا۔ ابھی ابھی ایک اور شعر کا اضافہ ہوا ہے۔ سنو۔

منہ کو کھولے ہوئے نوشاہ جو آگے لپکا
ڈر سے مالن یہ پکار اُٹھی کہ ہائے سہرا

دیکھو کتنا مشکل قافیہ تھا اور کس طرح بے ساختہ آیا ہے: "ہائے" کا لفظ بدشگونی سے بچ کہ باندھا ہے۔ تاریخ کی اطلاع ہوتی تو شاید کچھ اور بھی ہو سکتا لیکن اب تو غالباً بعد از وقت ہے۔

تم نے "فروغِ اُردو" والی کتابوں کے سلسلے میں پچھلی مرتبہ لکھا تھا کہ ڈاک کا خرچ ناقابلِ برداشت ہے۔ کیا فوٹو بھی اسی لیے نہیں بھیجی گئی۔ میں جو کتابیں بھیج رہا ہوں ان کے متعلق بھی یہی مشکلات درپیش تھیں لیکن ان کا مقابلہ کر لیا گیا ہے تم بھی اس مشکل کا مقابلہ کرو۔ اچھا بھائی محصول ڈاک کا بِل مجھے بھجوا دینا —— مجھے یہ الفاظ تنگ آ کر لکھنا پڑ رہے ہیں کاش تم جانتے کہ مجھے احباب کی تصاویر کی کس قدر خواہش ہے مگر آسودہ دل لوگ کیا جانیں۔ آخر یہ دو برس کٹ ہی جائیں گے۔

اگر ڈاک کل صبح مل گئی تو مزید لکھوں گا ورنہ والسلام۔

مخلص تاثیر

جمعہ

مکرر آنکہ

ابھی ابھی ڈاک ملی۔ میری بہت سی باتوں کا جواب آ گیا۔ تمہارا یہ فقرہ کہ دنیا میں محبت ہی سب کچھ نہیں ہوتی مجھے بہت پسند آیا۔ تم تو بڑے

بوڑھوں کی سی عقل رکھتے ہو ــــــ آذری کا خط بہت اچھا تھا۔ دل باغ باغ ہو گیا۔ تم میرے خط ذرا ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔ میں عجلت میں بغیر سیاق و سباق دیکھے لکھتا ہوں۔ اور دوبارہ پڑھے بغیر ڈاک میں چھوڑ دیتا ہوں۔ عام انداز باتوں کا ہوتا ہے جس کی وجہ سے عبارت بے ربط نظر آسکتی ہے لیکن اگر ٹھہر ٹھہر کر پڑھو تو شاید مفہوم کو سمجھنے میں تمہیں دقت نہ ہو گی۔

بزم کے مضامین کی تفصیل معلوم ہوئی۔ تم نے تو بے شمار موضوعات کو اس مرتبہ شامل کر لیا ہے۔ ان سب کے لئے علیحدہ علیحدہ اعلانات اور اشتہار لکھنا مشکل ہے۔ میں نے ایک نئے رنگ کا اشتہار سوچا ہے۔ جس کا ڈیزائن ساتھ بھیج رہا ہوں شاید یہ بعد از وقت ہو لیکن لکھ بھیجنے میں کیا ہرج ہے۔

تاثیر

ہمبرڈک کالج

کیمبرج

۱۴ / مارچ ۱۹۳۴ء

عزیزم۔ السّلام علیکم۔ تمہارا بحری خط ۲۰ / فروری کا لکھا ہوا آج پہنچا۔ اس میں سے تصویریں اور فروغِ اُردو کی مجالس کے اعلانات ملے۔ تمہارا خط بہت متردد حالات میں لکھا ہوا ہے۔ تم سا چلبلا اور جاندار شخص بالکل مفقود ہے۔ لیکن خیر ایسی ذہنی کیفیات سب پر طاری ہوتی ہیں۔ بعد کا لکھا ہوا ہوائی خط پریشان تھا مگر ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ عین تمہاری طرح۔ اس خط میں تم ستمبر میں آنے کو لکھ رہے ہو اور بعد کے خط میں تذبذب کا اظہار ہے۔ عزیزِ من یہاں لوگ دو دو سال تک بیٹھے رہتے ہیں اور داخلہ نہیں ملتا۔ تم تو محض تھرڈ کلاس بی اے ہو۔ آنرز ہوتے جب بھی کوئی بات تھی۔ تمہارے گُن یہاں کسے معلوم اور میں یہاں ایک معمولی

طالبِ علم ہوں معجزات نہیں کر سکتا۔ ڈوبا ہوا سورج دوبارہ نہیں چڑھ سکتا۔ وقت تنگ ہی نہیں ختم ہو چکا ہے۔ آگے تمہاری مرضی۔ میں تو لکھ لکھ کر ہار گیا ہوں۔

شادی پر مبارکباد پہلے ہی دے چکا ہوں۔ خیال یہ تھا تم ابھی اِس جھنجھٹ سے کچھ عرصہ آزاد رہنے کی کوشش کرو گے۔ لیکن تم اس کا فیصلہ کر چکے ہو تو مجھ سے زیادہ کسی کو تمہارے اس ارادے پر خوشی نہیں ہو سکتی۔ تاہم کہیں یہ نہ ہو کہ شادی ہوئی اور تم خانہ داماد ہو کر بیٹھ گئے۔ بیوی کو ساتھ لے آنا۔ مزے میں رہو گے بلکہ اُسے بھی یہاں کہیں داخل کرا دینا۔

تم کو تو کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں تم پچھلے دنوں طارق کو بھی لکھا تھا کہ بھائی جو لکھو صاف صاف بوضاحت تمام لکھو۔ محض اشارات سے کام لینا مجھ پر ظلم کرنا ہے۔ میں سات سمندر پار بیٹھا ہوں تمہارے سارے اشارے کنائے سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ اور جب کوئی بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی تو مجھے تشویش لگی رہتی ہے۔ اب اِسی ایک خط میں تم نے لائبریری اور پرچوں کا جو تذکرہ کیا ہے، وہ میری سمجھ میں خاک نہیں آیا۔ پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو آخر معلوم بھی تو ہو کہ کتابوں کے متعلق کس نے لکھا ہے؟ کس کو لکھا ہے؟ کہاں لکھا ہے؟ اور کیا

لکھا ہے ؟

"فروغِ اردو" کے اعلانات باعثِ فروغِ دیدہ ہوئے۔ اب میں انہی یادوں پہ تو جیتا ہوں۔ مگر یہ کہ تم آ پہنچو اور یہ سلطان مقصود کے متعلق افواہ صحیح ہے کہ وہ آرہا ہے۔ اسے یہاں تین سال لگانے ہوں گے اگر اس نے سینئر کیمبرج کر لیا تو۔ نہ کیا تو برباد ہو جائے گا۔ افسوس ہے کہ مقصود اس قدر ہونہار اور ذہین ہونے کے باوجود اتنا غیر ذمہ دار ہے۔ مگر میں اسے کیوں کچھ کہوں۔ یہ خود میرا اپنا قصور ہے مجھے چاہیے تھا کہ اس کی سرزنش کرتا اور اس کا زیادہ خیال رکھتا۔ مقصود مجھے دل سے پسند ہے اس لئے اس کے نتیجے کا حال پڑھ کر جی بہت کڑھا لیکن ابھی وقت ہے اور اس کے لئے سنبھلنا مشکل نہیں۔ یہاں آ گیا تو کم از کم حلضریوں کا جھگڑا تو مٹ جائے گا البتہ کام کرنا ہوگا۔ اور کام کرنے سے وہ یقیناً جی نہیں چراتا۔

اور بھئی تمہیں یہ کیسے وہم ہو گیا ہے گویا میں خدانخواستہ کلبوں میں پھرتا ہوں یہاں بہت بڑی شخصیت ہوں اور خدا جانے کس میں زندگی بھر رہا ہوں۔ بابا اگر میرے کسی فقرے سے یہ خیال گزرا ہے تو اس فقرے کو غلط تصور کر دو۔ کاٹ دو۔ یہاں آدمی قریباً ہر بزم کا ممبر ہو سکتا ہے۔ اور یوں جہاں چار آدمی بیٹھیں ایک محفل بنا لیتے ہیں

ایک سیکریٹری ایک پریذیڈنٹ۔ ایک خزانچی۔ اور دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی خبر نہیں۔ اگر تم کسی بزم میں سرگرم ہو تو دوسرے کسی اور میں۔ یوں ہندوستانی ہندوستانی سے سلام نہیں کرتا۔ ہاں واقفیت پر شریف آدمی ضرور باہم تپاک سے ملتے ہیں۔ مگر وہی چائے کا بدلہ چائے۔ میں نے آتے ہی ذرا امتحاناً ادھر اُدھر چسکیاں بھر کر دیکھا تھا۔ کوئی غیر معمولی "رعب انداز" معاملہ نظر نہیں آیا۔ اب تو ٹرم ختم ہونے والی ہے۔ اس خط کے ڈاک میں جانے تک ختم ہو جائے گی۔ اور میں خاموشی سے کام میں مصروف ہو جاؤنگا دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر۔ میرے ذمہ بہت زیادہ کام ہے اور راستے میں مشکلات غیر معمولی ہیں۔ لیکن روز بروز میرا اعتماد بڑھتا جاتا ہے اور آسانیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ تم آؤ گے تو خوش ہو گے۔ تمہیں مہدِ گل آراستہ مل جائے گا ورنہ نو وارد کے لئے کانٹے ہی کانٹے ہیں۔

مجھے ابتدا میں بے حد مصروفیتیں تھیں۔ بے اندازہ پڑھنا۔ لکھنا۔ لکھ کر دکھانا۔ بحثنا۔ یہی نہیں بلکہ ابتدائی تاثرات صحیح قسم کے پیدا کرنا جو خود بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ پھر اُداسی۔ منحوس خطوط۔ نئی دنیا اور نئے تعلقات۔ آتے ہی چند خبطیوں سے سابقہ اور بدمزگی ——
نئی عادات۔ نئی پابندیاں۔ نئی ملاقاتیں۔ نئی رسمیں۔ اور ان سب پر

عامۂ اثر اندازی کی فکر۔ غرض خارجی اور داخلی طوفانوں کی بے پناہ ٹکّروں سے دوچار ہونا پڑا۔ تم لوگوں کو کیا؟ مزے سے کامران [۱۹] کی بارہ دری میں ترنم ریزیاں ہو رہی ہیں۔ مقصود غالبؔ کی غزلیں گا رہا ہے۔ سراج نظامی اقبالؔ کا کلام سُنا رہا ہے اور احباب کشمیری چائے اور روغنی نانوں پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں ——— اور حریفانِ بادہ پیما کو کوئی نہیں پوچھتا۔

اب بزم کی کتاب کا مزید تذکرہ فضول ہے۔ خدا جانے تمہیں یہ کس نے بتادیا ہے کہ محصول ڈاک پر پچاس روپے صرف ہوں گے۔ آخر میں نے بھی تو چند کتابیں تمہارے پتے پر بھیجی ہی ہیں۔ بُک پوسٹ کر دو۔ یہ سستا ہوتا ہے۔ خاص وزن کے مختلف پیکٹ بنانا پڑینگے اور ایک طرف کھلی رہے گی۔ بڑے ڈاکخانے میں جاکر کسی آدمی سے یہ تفصیل دریافت کرلو۔ غالباً اِسی لاعلمی کی بنا پر تم اخبارات اور رسائل کے ورق پھاڑ پھاڑ مجھے بھیج رہے ہو۔ یا شاید ہندوستان کی دنیا بدل گئی ہے۔ کچھ کچھ انقلابات کی خبریں تو مجھے بھی پہنچ رہی ہیں۔ بہر حال تم فروغِ اُردو مجھے بھجوا سکتے ہو تو بھجوا دو ورنہ صاف نہیں کہہ دو۔ میں تمہارے وعدوں کی بنا پر ایک معزز آدمی سے جھوٹا ہو چکا ہوں۔ اور یہاں وعدے کو اہم اور لفظی طور پر صحیح سمجھا جاتا ہے۔ ناپسندیدہ رسم ہے لیکن

رائج الوقت ہے کیا کیا جائے۔ میں اس کتاب کے ادبی معیار پر انگلستان کے واحد پروفیسر آف اُردو سے جو لندن یونیورسٹی میں ہیں، رائے لینا چاہتا ہوں۔ اور ایک دو انگریزی رسائل میں بھی کچھ نکلوانا چاہتا ہوں۔ مگر تم ہو کہ سعید اللہ سے قرض بھی نہیں اُٹھا سکتے یا کیا؟ شاید اس میں میری کوئی ذاتی غرض سمجھ کر چپ ہو گئے ہو۔ حالانکہ یہی تمہیں مستعد کرنے کی بہترین وجہ ہونی چاہیئے تھی۔ آج تک تو رہی ہے۔ بھائی اس ملک میں قدیم کتابوں پر ریویو نہیں ہوا کرتے۔ اور یہاں چند ماہ میں کتاب "قدیم" ہو جاتی ہے۔ تمہاری کتاب پر تو تاریخ اشاعت جون ۱۹۳۲ء ہے۔ خدا جانے تمہاری قوتِ ارادی اور صلاحیتِ کار کس کی نذر ہو گئی۔

اور ہاں بھئی تمہاری کتاب کے لئے جو اشتہار کتب فروش نے دیا ہے، خوب ہے۔ اس میں ہندوستان بھر کے نقادوں کے نام درج ہیں اور مجھے تم نے ان حالات سے مطلع ہی نہیں کیا۔ کس کس نے کیا کیا لکھا ہے۔ اگر نقل بھجوا سکتے ہو تو فوراً بھجو۔ مجھے خوشی ہو گی۔ مگر مجھے اس اشتہار میں یہ لفظ پسند نہیں آئے! "اس کتاب کا حوصلہ افزا الفاظ میں خیر مقدم کیا ہے"۔ یہ ٹکڑا بیہودہ ہے اگر دوبارہ اشتہار چھپے تو کٹوا دو۔ التزاماً۔ اگر بدلنا چاہو تو حوصلہ افزا کی جگہ ستائشی رکھ لو۔ مگر حوصلہ افزا ہرگز نہیں۔ اس میں تمہاری سبکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ اشتہار تم نے خود مرتب کیا ہے۔

ایسے موقعوں پر تمہیں چاہیئے کہ پنڈت ہری چند اختر سے مدد لو۔ اُن سے ملتے رہو اور کوئی کام ان کے مشورے کے بغیر نہ کرو۔ بلکہ ان کو لکھ کر دکھا لیا کرو۔ تمہیں مشورے کی ضرورت ہے اور اس میں تساہل نہیں برتنا چاہیئے۔۔

اگلے مہینے بوٹ ریس ہے۔ طیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ ہم کیمبرج والے جیتیں ہی جیتیں گے۔ آکسفورڈ پہلے سے زیادہ کمزور ہے اور ہم پہلے سے زیادہ مضبوط۔ کیا ممکن ہے کہ آئندہ سال میں اور تم یہ مقابلہ اکٹھے دیکھیں۔ تم کہو گے کہ فکر نہ کیجئے یہ مقابلہ یہاں بھی سینما میں جا کر دیکھ سکتا ہوں لیکن بھائی وہ آنکھوں سے دیکھنے والی کیفیت سینما کے دیدار سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ آگے تمہاری مرضی۔

فقط والسلام

مخلص تاثیر

ہمبروک کالج

کیمبرج

۲۸ مارچ ۳۴ء

عزیزم۔ السلام علیکم۔ تمہارے سب خط ملتے رہے ہیں وہ فوٹو بحری ڈاک میں تھا اس لئے مغالطہ ہوا۔ لیکن فرغ اردو کی کتابیں نہ ملیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس سلسلے میں پروفیسر بلی سے ملنے کے لئے اب پھر فرصت کی تلاش کرنی پڑیگی اور نئی ملاقات کے لئے ایک مرتبہ پھر لندن جانا پڑے گا۔ حالانکہ ٹرم کے دوران میں یہاں سے نکلنا ناممکن ہے۔

فوٹو کے متعلق مجھے شکایت ہے کہ تم لوگوں نے اس پر دستخط نہیں کئے۔ رہا تمہارے آنے کا معاملہ تو میں اس سلسلے میں اب خاموش ہوں۔ جو جی میں آئے کرو۔ تمہارا تذبذب اور دلائل میری سمجھ سے باہر ہیں۔ میں بہر حال راضی برضا ہوں۔ تمہیں کیا معلوم کہ ایک دن کی

تاخیر بھی کس قدر نتائج خیز ہو سکتی ہے ۔۔۔ مجھے تمہارے آنے سے کس قدر خوشی ہوتی ۔ تم آتے تو کئی سکیمیں صورت پذیر ہو سکتی تھیں !

سینما کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ مذاق نہیں ۔ مگر مجھے ابھی یہاں زیادہ اہم معاملات درپیش ہیں ۔ زیادہ ضروری گتھیوں کو سلجھانا ہے ۔ اور آہستہ آہستہ قدم جمانا ہے ۔ تم اس ملک کو جانتے ہوئے ایسے اضطراب کا کیوں اظہار کرتے ہو ۔ جبھی تو گھبرا کر بھاگ آئے تھے ۔ اب یہاں آئے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس مضمون پہ بندہ اب خاموش رہنے کا عہد کر چکا ہے ۔۔۔ ہاں یہ تو لکھو کہ ڈاکٹر سعید اللہ کے گھر کا پتہ کیا ہے ۔ ان کے گھر پر ڈوڈ روڈ خط لکھنا چاہتا ہوں ۔ مگر گھر کا نمبر معلوم نہیں ۔ ان سے پوچھا بھی تھا مگر وہ خاموش ہیں شاید وہ ورق جن پر اطلاع مانگی تھی ، تمہارے پاس ہی رہ گئے ہیں ۔ ع

ہمیں ورق کہ سیاہ گشت مدعا اینجاست

والا معاملہ دکھائی دیتا ہے ۔

لنڈن گیا تھا ہفتہ رہا ہوں ۔ بیشتر حصہ میوزیم میں کٹا ۔ کچھ سیر کی ۔ سینما دیکھے ۔ باہر کینٹ کی طرف مضافات میں بھی گیا تھا ۔ ایسٹ اینڈ کو "رگما خفتہ" دیکھا وہاں تمہارے جالندھر کے لوگ مل گئے ۔ غرض ہر روز صبح سے رات تک مصروف رہا ۔

لاہور سے ایک انگریزی میں ہفتہ وار پرچہ نکلتا ہے۔ ویکلی میل۔ اس میں کبھی کبھی لکھنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ اگر میں اس التزام کو قائم رکھ سکا تو شاید تمہارے لئے سامانِ لطف مہیا ہو سکے۔ اسے ضرور پڑھا کرو۔ اس نے مسلمانوں کی حمایت میں بڑی بہادری اور جرأت سے آواز بلند کی تھی —— مجھے کمیشن وغیرہ نہیں ملتی۔

آذری کے خطوط بڑی دلچسپ ہوتے ہیں۔ کچھ عرصے سے خاموش ہے۔ بھئی عجب بے فکر آدمی ہے۔ خدا اُسے دنیاوی تفکرات سے آزاد رکھے۔ حفیظ جالندھری کا ایک خط پرسوں بحری ڈاک میں آیا۔ یہ اس کا پہلا خط ہے خدا جانے کوئٹہ سے لکھا ہے کہ دکن سے۔ ڈاکخانے کی مہر بہر حال لاہور کی ہے۔ طبیعت بشاش ہو گئی ہے اور شکایت جاتی رہی۔

اس مرتبہ لمبا خط نہیں لکھتا۔ اس لئے نہیں کہ تمہارا خط لمبا نہیں بلکہ اس لئے کہ ڈاک اب کے پھر بے وقت آئی ہے اور یہاں کی ڈاک کا وقت تنگ ہو چکا ہے۔ سُنا ہے کہ اپریل سے ڈاک کی رفتار تیز تر ہو جائیگی۔ یعنی ہم قریب تر ہو جائیں گے۔ والسلام

مخلص تاثیر

کیمبرج
۵ / اپریل ۱۹۳۴ء

عزیزم - السلام علیکم - اب کے تمہارا خط قریباً ہر طرح تسلی بخش تھا۔ فقط بزم کی کتابوں کا معاملہ حسبِ دستور کھٹائی میں تھا اور بمبئی میں تحفوں کا طالب نہ تھا۔ کیوں جھوٹی معذرت کر رہے ہو۔ اب تو عید گذر گئی ہے۔ تاہم ممکن تحفے [۲۰] بتائے دیتا ہوں۔ ہو سکے تو بھجوا دو۔

۱- دو تولہ عطر جوہی درجہ اوّل از لکھنؤ۔

۲- پان میں کھانے والی گولی نقرہ ــــــ حسبِ استطاعت۔

۳- معارف پریس سے عمر خیام پر ایک معرکہ آرا کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کی ایک نقل۔

نمبر ۱ اور ۳ بہت ضروری ہیں۔ بزم کی کتابوں کا مطالبہ نہیں کرتا کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اب گاؤ خورد ہو گیا ہے۔ دوسری کتاب کے مضامین کی اشاعت کی اطلاع تمام ادبی رسائل اور جملہ جرائد کو

بھیج دو میں دیباچہ لکھ دونگا لیکن سر عبدالقادر نے وعدہ کر لیا تو پھر ان کے نام کا اعلان ہونا چاہیئے۔

میں نے تمہارے یہاں آنے کے متعلق خاموش رہنے کا ارادہ کیا ہے مگر کیا کروں تم مجبور کر دیتے ہو۔ اس لئے آخری مرتبہ پھر لکھتا ہوں کہ اگر آنا ہو تو فارموں کو بھجوا دو۔ سرٹیفکیٹ بعد میں آسکتے ہیں۔ ان دنوں یونیورسٹی بند ہے کھلے تو تمہارے متعلق آخری بات معلوم ہو گی۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تمہارا داخلہ قریباً محال ہے۔

شادی مبارک ہو۔ آخر احباب سے کیوں چھپاتے ہو۔ مجھے تو آذری مارت ہوئی لکھ چکا ہے۔ طارق نے بھی کچھ کچھ غمازی کی ہے مگر وہ تم سے خائف ہے اس لئے کھل کے بات نہیں کرتا۔ حفیظ جالندھری اور پنڈت ہری چند کے خطوط آئے۔ دل باغ باغ ہو گیا مگر حفیظ سے کہو کہ ذرا نصائح کم کر دے۔ مانا کہ وہ فردوسیِ اسلام ہے لیکن میں بھی تو بڈھا ہو چکا ہوں۔

یہاں موسم بدل رہا ہے۔ قافلۂ گل چمن میں آپہنچا ہے۔ شاخ بشاخ چلا آرہا ہے۔ مگر کرنا کی بدمست خوشبو کہاں۔ بھئی ہو سکے تو عطر جوہی ضرور بھجوا دو۔ ابو سعید کا کیا حال ہے۔ خوب پڑھ رہا ہے؟ سلطان مقصود۔ بشیر اور ناظم یہ تینوں سینئر کیمبرج کر رہے ہیں۔

یا کیا؟
اگلی دفعہ مفصل تر لکھوں گا۔ اب ڈاک کی بے ترتیبی۔ اور سعید اللہ اور بدر [۲۱] کے نام لمبے خط لکھنے کی وجہ سے وقت کم رہ گیا ہے۔

فقط والسلام

مخلص تاثیر

کیمبرج
۱۲ر اپریل ۱۹۳۴ء

عزیزم السّلام علیکم۔ میں کل ہی لندن سے واپس آیا ہوں۔ چند ضروری کتابوں کے مطالعے کے لئے برٹش میوزیم کا چکر کاٹنا پڑا۔ وہاں کئی باتیں ایسی مشاہدے میں آئیں کہ ان پر لکھنے کو جی چاہا۔ بزم کا خیال آیا کہ جہاں میرے الفاظ مدتوں تم سب کی سمع خراشی کرتے رہے ہیں، وہاں میں خود اپنے خیالات پیش کر سکتا۔ گو اب ہم میں بُعدِ مکانی ہے مگر دل کی راہیں، آئین شٹائن کے نظریوں سے بہت پہلے زمان و مکان کی بندشوں سے آزاد ہیں اور محبت کی دنیا میں ظاہری آنکھ کی بینائی کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ کیا زانو بزانو بیٹھنے والے خیالات اور جذبات کے اعتبار سے کوسوں دور نہیں ہو سکتے اور کیا یہ ممکن نہیں کہ کوسوں دور بیٹھے ہوئے بھی دو دل ایک ہی لے ایک ہی آہنگ میں دھڑک رہے ہوں؟ اور جب انسان کی اصلیت اس کے خیالات، جذبات اور

احساسات ہی ہیں تو پھر جبکہ تم یہ خط پڑھ رہے ہو تو بھی کیوں نہ سمجھو کہ میں خود تم سے بول رہا ہوں۔ خود تمہارے سامنے موجود ہوں۔ تم اور میں آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل، کے مصداق ہیں لیکن یقیناً جسمِ انسانی پر دماغ کو ہمیشہ فضیلت رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں تمہیں لکھتا ہوں تو اِس حقیقت کو بھول جاتا ہوں کہ یہ خط ہے۔

لہ یہاں سے خط کا مضمون چونکہ ایک مستقل مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لئے اسے نئے صفحے سے شروع کیا جاتا ہے۔ [مرتب]

فارسی ادب کے چند گمشدہ اوراق

[۲۲] مجھے اپنے کام کے سلسلہ میں پرانے انگریزی مسودات دیکھنے کے لئے اپنی دانش گاہ کیمبرج کو چھوڑ کر لنڈن برٹش میوزیم میں کئی بار جانا پڑتا ہے۔ اور جب کبھی میں اُس شور و غوغا کی دنیا سے واپس لوٹتا ہوں تو مجھے کیمبرج کی گلیوں میں وطن کی سی عافیت کی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے۔ اور میں پہروں کھو سا جاتا ہوں اور اپنے ماحول کو بھول کر کسی ایسے ہی کمرے میں۔ اِسی طرح کی مجلس میں باتیں کرنے

لگتا ہوں۔ شاعری، مصوری، فلسفہ، مذہب، تاریخ، تنقید اور نہ جانے کیا کیا کچھ ——— سائنس تک موضوعِ سخن بن جاتی ہے اور تا آنکہ مالکۂ مکان دروازہ کھٹکھٹا کر مسکراتی ہوئی دخل انداز نہیں ہو جاتی یہ خیالی سلسلۂ کلام جاری رہتا ہے۔ (آپ بھی اسی طرح مسکراتے ہیں۔ دل و دماغ پہ قابو رکھیئے۔ یہ مالکہ چالیس سال کی چڑیل ہے اور یہ چالیس سال بھی اس کے اپنے بتائے ہوئے ہیں۔)

آج کی گفتگو بھی برٹش میوزیم سے مراجعت کا نتیجہ ہے۔ مجھے وہاں ایک کتاب کے انتظار میں یونہی ریو RIEU کی شہرۂ آفاق فہرست مسودات مشرقیہ کی ورق گردانی کرتے ہوئے سلطان سلیم کا نام دکھائی دیا۔ اور میں اپنا اصلی کام بھول کر اس کی سراغرسانی میں مشغول ہو گیا اور بقول حفیظ ۔ ع

اپنی منزل بھول کر اس رنگ و بو میں کھو گیا

مجھے سلطان سلیم سے بچپن سے محبت ہے۔ ترکوں میں بیسیوں باجبروت سلطان ہوئے ہیں۔ بیسیوں فنون و ادب کے سرپرست اور صاحبِ دیوان تھے۔ لیکن سلطان سلیم کی بات کسی کو نصیب نہیں ——— سلطان محمد فاتح کو لیجئے کیسی حیرت انگیز شخصیت تھی۔ یہ جواں ہمت فاتح بائیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور دو سال میں

ابو الفتح کے لقب سے مشہور ہوگیا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ جب اُس نے چند مہینوں میں اس عظیم الشان شہر کو بھی جو کبھی مرجع ادبأ و فضلا تھا۔ مگر اب برسوں سے بازنطینی فرمانرواؤں کی ذلیل حرکات کی بدولت جہالت و بہیمیت کی آماجگاہ ہو رہا تھا، فتح کیا اور دوبارہ علم و فن کا مرکز بنا دیا۔ مگر ہمارے مغربی مورخ فتح قسطنطنیہ کو ہمیشہ یوں ظاہر کرتے ہیں جیسے بادِ صرصر کے ایک جھونکے سے علم و فن کی شمع ہمیشہ کے لئے گُل ہو گئی۔

سلطان محمدؒ کی دنیوی فتوحات بے مثال سہی۔ لیکن اس کی علمی خدمات بھی اپنی نظیر آپ ہیں۔ اس نے ایک نہیں آٹھ کالج قائم کئے۔ اور ان سب کو ایک یونیورسٹی میں جسے ثمانیہ کہتے ہیں، مدغم کر دیا۔ ان کالجوں کے عقب میں عظیم الشان عمارتیں تھیں۔ جن میں کئی سو نادار طلبأ رہتے تھے۔ جن کی رہائش اور خوراک کا انتظام سرکار کی طرف سے تھا۔ آج کیمبرج اور آکسفورڈ انہی روایات پہ قائم ہیں (گو مجھ جیسے نادار طالب علم کی کھال اتار لیتے ہیں) ثمانیہ کے بعد دیگر سلاطین نے اور بہت سے کالج اور یونیورسٹیاں بنائیں۔ مگر لائحہ عمل وہی رہا۔ گب کی تاریخ ادبیاتِ ترکی پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسروں کے تقرر، فیلوشپ کی تعین اور معیارِ درس و تدریس میں سلطان کا نظام

آج کل کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی سے بہت بہتر تھا۔ ایک مختصر سا
خاکہ عرض کرتا ہوں۔

ابتدا میں نوجوان "طالب" کو "خارج" کی جماعتوں میں لیا جاتا تھا۔
پھر اعلیٰ جماعتوں میں "داخل" سمجھا جاتا تھا۔ یہ خارج اور داخل کے مدرسے
ہر شہر میں تھے۔ اور یہ گویا صحن ثمانیہ یعنی یونیورسٹی کی طیاری کے سکول
تھے۔ سینئر کیمبرج سکولوں کی طرح ان کو مصلائے صحن کہا جاتا تھا۔
ان کا نصاب بھی ملاحظہ ہو: گرامر۔ صرف اور نحو۔ منطق۔ فلسفہ۔ یا علم الکلام۔
علم ادب۔ علم معانی۔ علم بیان۔ علم بدیع۔ علم ہندسہ۔ اور علم ہیئت۔
"طالب" کو یہ سب کچھ پڑھنا ہوتا تھا۔ کیتھی بی۔اے کے طلبا کیا فرماتے
ہیں اس مسئلہ کے متعلق۔ جو طالب ان امتحانات میں پاس ہو جاتا تھا،
اُسے "دانشمند" کا خطاب ملتا تھا۔ اور اسے امامت یا ابتدائی مدرسی
کا اہل سمجھا جاتا تھا۔ اب "صحن" کا دور شروع ہوتا تھا۔ یہاں قانون فقہ
کا درس تھا۔ پہلی ڈگری "ملازم علم" کی تھی۔ جس کے بعد اس کا نام روزنامچہ
ہمایوں میں درج ہوتا تھا۔ یہاں کیمبرج میں اسے خاص اہتمام سے کیا
جاتا ہے۔ بندے کو بھی سابقہ پڑ چکا ہے نہ مٹنے والی سیاہی سے
چمڑے کے کاغذ پر چاندی کے قلم سے کالج کے رجسٹر میں نام تحریر کیا گیا
اور پھر ہمیں جلوس کی صورت میں یونیورسٹی کے دفتر میں لے جایا گیا وغیرہ

وغیرہ) پھر "ملازم علم" کو بلاغت اور کلام کے اعلیٰ مدارج میں داخل کیا جاتا تھا۔ اور علم عقائد کے علاوہ علم فقہ اور علم حدیث اور علم تاویل کی باریکیوں سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ "ملازم علم" بہت سے سال گذارنے کے بعد دوبارہ امتحان دیتا تھا۔ اور اسے نائب یا قاضی کی ڈگری ملتی تھی۔ لیکن تعلیم کو جاری رکھنے کے خواہشمند "مدرس" کی ڈگری لیتے تھے۔ مدرس کی ڈگری کے کئی مدارج تھے۔ سلطان محمدؒ نے چار درجے بنائے تھے۔ اول "خارج"۔ دوم "داخل" سوم "صحن" چہارم "التمشلو (ال تمش لو) مدرس کے آگے علما کا درجہ تھا۔ جس کے بہت سے مراتب تھے۔ سلطان سلیمان نے ان کی اور زیادہ تخصیص و تقسیم کر دی تھی۔ سلیمانیہ یونیورسٹی میں مدرس کی ڈگری کے بارہ مدارج تھے۔ ابتدائے خارج۔ حرکت خارج۔ ابتدائے داخل۔ حرکت داخل۔ بمصلائے صحن۔ صحن ثمانیہ۔ ابتدائے التمشلو۔ حرکت التمشلو۔ مصلائے سلیمانیہ۔ خواص سلیمانیہ۔ دار السلیمانیہ۔ ان کڑی منزلوں کے طے کرنے کے بعد پھر پروفیسر اور مفتی کے مراحل تھے۔ ہاں جی۔ ہماری تمہاری طرح نہیں کہ روپیٹ کر بی اے کیا۔ گرتے پڑتے ایم اے پر ہاتھ مارا اور بن گئے پروفیسر اور لگے کالج میں للکارنے بس ــــــ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ سلطان محمد کے ہمہ گیر دماغ کو اس نظام کی فرصت کب ملی ہوگی

سلطان فنونِ لطیفہ کا بھی سرپرست اور قدردان تھا۔ یونیورسٹی اور کالجوں کی عمارتوں کے علاوہ حضرت ابوایوب انصاری کا مقبرہ اس کی عقیدت اور قدردانی کی یادگار ہے۔ اِسے مصوّری کا بھی ذوق تھا۔ یہ چرچا اٹلی کے مشہور مصوّر جنٹلے بیلنی (JENTILE BELLINI) کو قسطنطنیہ کھینچ لایا۔ لنڈن کی نیشنل گیلری میں ایک پاکیزہ تصویر آویزاں ہے جو سلطان اور اس مصوّر کے نام منسوب ہے۔ ایک فرانسیسی مورخ نے سلطان اور بیلینی کے متعلق ایک مستقل کتاب لکھی ہے (ہمارے مولوی عبداللہ صاحب نے ۱۹۲۲ء میں کاروان میں اِس موضوع پر ایک مضمون تحریر فرمایا تھا) کہا جاتا ہے کہ جب یہ خوش نصیب مصور اپنے وطن واپس آیا تو سر سے پاؤں تک جواہرات میں لدا ہُوا تھا۔ اور اسکی ملکی حکومت نے اسے سلطان کی سرپرستی کا فخر حاصل ہونے کی وجہ سے عمر بھر کے لئے پنشن عطا کر دی۔ جو لوگ فتح قسطنطنیہ کو علوم و فنون کی تباہی کے مترادف قرار دیتے ہیں غور فرمائیں۔ ہمعصر مغربی حکومتیں سلطان کے دربار کو اپنا MODEL سمجھتی تھیں۔ اور جس مصور کو نوازتا تھا اس کو اپنے ملک میں بھی سرفرازی حاصل ہوتی تھی۔

سلطان کو شعر و ادب کا بھی ملکہ کامل تھا۔ وہ خود صاحبِ دیوان تھا۔ اور اس کے سارے مصاحب شعر و سخن سے بہرہ ور تھے۔ ہر دور کے

میں اس کے سامنے ادبا کا مجمع رہتا تھا۔ اور خلوت و جلوت کی فرصتوں میں شعر و شاعری ہی پر گفتگو رہتی تھی۔ لطیفی اپنے تذکرے میں (برٹش میوزیم میں موجود ہے) ایک پر لطف واقعہ بیان کرتا ہے۔ سلطان اور اس کے زعماء دیوان حافظ سے تفاول کر رہے تھے۔ اور ہر کوئی اپنے متعلق حافظ کی رائے دریافت کر رہا تھا۔ سلطان نے ورق کھولا تو سامنے یہ شعر پایا کہ

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

سب درباری اُچھل پڑے۔ لیکن سلطان نے کہا کہ یہ صوفیائے کرام اور علمائے عظام کی شان ہے۔ احمد پاشا جو اس عہد کا ملک الشعرا تھا فی البدیہہ یہ بولا

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
خاکِ جواہر قدمت توتیا کنند

اور سلطان "الفضل للمتقدم" کہہ کر مسکرا دیئے۔ صالحین سے عقیدت کی بدولت سلطان نے جامی علیہ الرحمۃ کو خود ایک خط لکھا۔ میری نظر سے گذرا ہے۔ سالانہ وظیفہ مقرر کرنے کی اطلاع یوں دی ہے — جیسے کوئی سوال کرتا ہے۔ جامی کی پند و نصیحت کو احترام سے قبول کیا ہے اور

آخر میں ایک شعر جامی کی شان میں نقل کیا ہے۔ ؎

چناں دادِ سخن دادست جامی
کزاں شد تازہ ارواحِ نظامی

یہ علم پروری اور فضیلت نہ ہوتی تو جامی ایسا خدا رسیدہ بزرگ اپنے منظوم خط میں سلطان کی نسبت یہ نہ لکھتا ؎

کم کسے بر سریرِ جاہ و جلال
چوں تو کردہ اکتسابِ فضل و کمال

جامی کی شان دیکھئے۔ کیسے محتاط الفاظ استعمال کئے ہیں۔ کم کسے لکھا ہے بالکل نفی نہیں کر دی۔ اور پھر سریرِ جاہ و جلال کی شرط بڑھا دی ہے۔ یہ نہیں کہا دنیا میں نہ کوئی ایسا ہوگا نہ ہوا ہے! —— اور اکتساب کی تعریف کی ہے —— یہ تھے ہمارے سلاطین اور ہمارے شعرا۔

اور یہ ہیں ہم اور تم! ——

سلطان کا دیوان ترکی میں ہے۔ لیکن اس کے کئی خطوط عربی اور فارسی میں ہیں۔ سلطان کے تخیل کی بلندی کا پتہ چلتا ہے۔ فتح قسطنطنیہ کا آخری فیصلہ کن حملہ صبح صادق کے قریب ہوا تھا۔ لکھتے ہیں:۔ "از خشک و دریا ہمچوں نجوم سما رجوماً للشیاطین ہجوم نمودہ —— و نیّرِ اعظم از ہر دو طرف خواست" لیکن معرکہ کا خط وہ ہے جو قرمان کے حاکم

ابراہیم بیگ کے نام ہے۔ اور جس میں ماجار۔ روس۔ بلغاریہ اور کئی ایک اور مغربی قوموں کی متحدہ فوج کی شکست کا تذکرہ ہے۔ یہ جنگ اورنہ تھی اور اس میں مغربی افواج کا سپہ سالار شہنشاہِ قیر آل مارا گیا تھا۔ توپوں اور بندوقوں کی آتشباری کے بعد دست بدست قتال کی نوبت آئی "چنانچہ از اول روز تا آفتاب جہاں بحدِ غروب رسید بحرب و قتال کوشش نمودند۔ تا ہفت بار حملہ آوردہ۔۔۔۔ مگر کفار از حدتِ شمشیر آبدار و سنانِ اژدہا کردار۔ ترساں و ہراساں نمی شدند"

نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لشکرِ اسلامی دشمن کی اِس غیر معمولی مقاومت سے اور خود بار بار حملے کرنے سے تھک کر سراسیمہ سا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر سلطان بے خوف و خطر اور خلافِ مصلحت خود صفِ اول میں آ کودے۔ اور ایک ایک سپاہی کا نام لے لے کر للکارنے لگے۔ بس پھر کیا تھا نقشہ بدل گیا۔ "مرداں دلیراں چوں شیرِ زماں از یمین و یسار رو مار۔ از روزگارِ کفار خاک آوردند۔۔۔۔ وما النصر الا من عند اللّٰہ العزیز الحکیم"!

سلاطینِ آلِ عثمان کے بہت سے مکتوبات لندن کے کتب خانوں میں ملتے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے نام۔ بہمنی سلاطین کے نام۔ عزیزِ مصر اور شریفِ مکّہ کے نام اور فرمانروایانِ فرنگ کے نام اور ان

کے جوابات بھی، غرض یہ ایک تاریخی خزانہ ہے جس سے مشرق و مغرب کے سیاسی توازن اور تعلقات پہ ایک نئی روشنی پڑتی ہے۔ کیا یہ پر لطف واقعہ نہیں کہ انگریز مدتوں کوشاں رہے کہ ان کا کوئی سفیر بابِ عالی میں باریاب ہو سکے۔ اور جب کوئی نصف صدی کی پیہم و سنگ زنی کے بعد یہ شرف حاصل ہوا تو ایلزبتھ کا قائمقام ترکی سلطان کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ سپین بت پرست ہے اور انگلستان بت شکن لہذا مستحق امدادِ اسلام ہے۔

ابوالحسنات سلطان فاتح کا جانشین بایزید ثانی واقعی بایزید بسطامیؒ کا ثانی تھا۔ ملک بھر میں اسے ولی سلطان کہہ کر پکارا جاتا تھا یہ مجاہد تلوار کا دھنی بھی تھا۔ اور علم کا سرپرست بھی۔ اِس نے جامیؔ کے نام وظیفہ قائم رکھا اور اخلاق جلالی کے مصنّف علامہ جلال الدین دوانی کا وظیفہ مقرر کیا۔ اور باپ کی طرح خود اپنے ملک کے علماؑ فضلا کی قدردانی کی۔ شاہزادگی ہی میں اِس کا دربار شعرأ اور امرأ کا مرجع تھا۔ آلِ عثمان کا یہ بہت پرانا دستور تھا کہ شہزادوں کو اوائل عمر ہی میں صوبوں کی گورنری تفویض کر دی جاتی تھی۔ اور علمأ شعرا کو ان کے اتالیق اور مہتمم امور بنا دیا جاتا تھا۔ چنانچہ بایزید ثانی نے اپنے سب سے بڑے بیٹے شہزادہ عبداللہ کو قرمان کا والی مقرر کیا اور سنجاقی کو اس کا کاتبِ دیوان

بنا دیا۔ نجاتی اپنے عہد کا سب سے بڑا ترکی شاعر تھا۔ لیکن مجھے اِس کے فارسی کے اشعار پسند نہیں آئے۔ نجاتی غالب کی طرح ایک خاص وصف کا مالک تھا۔ جس طرح غالب کے ممدوح کا جاں بر ہونا محال تھا۔ اسی طرح نجاتی کے سرپرست پر بھی آفت کا آنا یقینی تھا۔ چنانچہ شہزادہ عبداللہ دو سال کے اندر وفات پا گیا۔ اور نجاتی ایک مرثیہ لکھ کر قسطنطنیہ واپس لوٹ آیا۔ کچھ دیر کے بعد سلطان کے ایک اور فرزند شہزادہ محمودؔ کا نشانچی یا چانسلر مقرر کیا گیا۔ نجاتی اِس شہزادہ کی سرپرستی میں خوب چمکا اور اس کا بہترین کلام اِسی عہد کا ہے۔ نجاتی نے اپنا دیوان بھی شہزادہ محمود کے نام معنون کیا ہے۔ مگر یہ سرپرستی شہزادہ کے حق میں قاتل ثابت ہوئی۔ چنانچہ وہ تین سال کے اندر وفات پا گیا۔ اور نجاتی نے ایک اور دل دوز مرثیہ لکھ ڈالا۔ سلطان بایزید اور نجاتی کے دیگر مہربانوں نے نجاتی کو اور عہدے دینے چاہے مگر اس نے نہایت دانشمندی اور مصلحت اندیشی سے کام لیا اور یکمال ترحم ماہوار وظیفہ قبول کر کے قسطنطنیہ میں نہایت عافیت سے زندگی گزار دی۔ مگر اس عہد کی سب سے زیادہ دلچسپ شخصیت شہزادہ جمؔ ہے جو سلطان محمد فاتح کا فرزند اور بایزید کا بھائی ہے۔ ترکی میں اِس کا ایک مستقل دیوان ہے۔ جو عام ملتا ہے مگر اس کا فارسی کلام بہت مشکل سے دستیاب

ہوتا ہے۔ لیکن اِس میں ایک ایسا ذاتی انداز جھلکتا ہے کہ اس کے حصول کے لئے تگ و دو کرنا بیکار نہیں جاتا۔

شہزادہ جسم عربی، فارسی، اور ترکی میں ماہر تھا۔ اور مغربی زبانوں میں دسترس تامہ رکھتا تھا۔ اِس کی زندگی کا یہ مغربی حصّہ بے حد دردناک اور عبرت خیز ہے۔ سلطان فاتح کی وفات پر شہزادہ جم بھی سلطنت کا دعویدار تھا اور چونکہ شرعِ اسلامی میں شاہی کے لئے وراثت مشروط نہیں لہٰذا اِس معاملہ میں چھوٹے بڑے بھائیوں کی باہمی فوقیت ہمیشہ معرضِ بحث میں رہی ہے۔ اور نگ زیب علیہ الرحمۃ کی تخت نشینی اس کی مشہور مثال ہے مگر جم محض شاعر ہی تھا۔ آرزوؤں اور تخیلات کا بندہ۔ انتظامی اور جنگی امور کے لئے نا اہل تھا۔ چنانچہ بایزید نے بہت جلد اس کی جمعیت کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ مگر اس نے اِس شکست سے عبرت حاصل کرنے کی بجائے آرزوؤں کی فریب کاری کو دلیلِ راہ بنایا۔ اور اطاعت کی بجائے سلطان بایزید کو لکھ بھیجا کہ وہ اِس سے سلطنت تقسیم کر لے۔ بایزید کا جواب تحمل اور وقار کا آئینہ دار ہے خطاب یوں کیا ہے "جناب اخوت مآب محبت نصاب برادرم جمؔ اصلح اللہ تعالےٰ احوال شانہٗ"...... یہ محض رسمی خطاب نہیں۔ اصلح اللہ تعالیٰ میں نہایت مخلصانہ دعا ہے۔ جو ہر طرح حسبِ حال تھی!——

اِسی خط میں لکھا ہے کہ سلطنت ذاتی معاملہ نہیں۔ اور اس کے وزراء اور رفقاء سب اِس امر میں متفق ہیں کہ "دو درویش بہ گلیمے بخسپند و دو بادشاہے بہ اقلیمے نگنجند۔۔۔۔۔۔۔۔ لہذا شہزادہ جمؔ کو چاہیئے کہ وہ وظیفہ لے کر اطمینان سے زندگی گزارے" "ہمہ سال از مال بیت المال بخدمت ارسال نمودہ تا بلوازم خود خرچ کردہ ——— ایشاں باں مقدار قناعت نہ نمود۔ و باغوا غلبۂ ہوس نفسِ امارہ محرکِ سلسلۂ فتنہ گشتہ" ——— لیکن اِن باتوں کے باوجود بایزید نے وظیفہ کا دوبارہ وعدہ کیا۔ مگر جم راضی نہ ہوا۔ اور ایک ایسی حرکت کا مرتکب ہوا جس کی سزا نہایت دردناک تھی ——— یعنی وہ تنہ کی چھوڑ کر کفارِ فرنگ کے پاس پناہ گزین ہو گیا اور روڈز کے صلیبی لٹیروں کے دامِ فریب میں پھنس گیا۔ جمؔ نے اپنے آبائی وطن کو ۲۶ جولائی ۱۴۸۲؁ء کو خیر باد کہا۔ اور پھر دوبارہ واپس آنا کبھی نصیب نہ ہوا۔

روڈز میں شہزادہ جمؔ کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا۔ اور اس کے رفقاء کی خوب خاطر تواضع کی گئی۔ مگر باوجود حلفی عہد دپیمان کے کہ شہزادہ اپنی نقل و حرکت میں پوری طرح آزاد ہو گا۔ اِن "عیسوی مجاہدوں" نے شہزادہ کو ایسا گرفتار کیا کہ آخر دم تک نہ چھوڑا۔ شہزادہ کی سادگی ملاحظہ ہو کہ جب اِسے شاہِ فرانس کے پاس بھیجا گیا اور نیس NICE

میں مقید کر دیا گیا تو وہ اِسے مہماں نوازی سمجھ کر خوش تھا۔ اِس نے اپنا ترکی دیوان بھی یہیں مرتب کیا۔ لیکن اِسے چند مہینوں کے بعد صورتِ حالات سے آگاہی ہو گئی۔ اور اس کی زندگی کے باقی ماندہ دن تاسف اور غم واندوہ میں گذرے۔ جمؔ یورپ میں تیرہ سال زندہ رہا۔ اور تمام عرصہ یورپ کے فرمانرواؤں کی گلِ بازی بنا رہا۔ کیونکہ جمؔ کی حفاظت اور اخراجات کے لئے بایزید ایک معقول وظیفہ دیتا تھا۔ یہ بھوکے لٹیرے ان روغنی ٹکڑوں پر باہمی دست و گریباں رہتے تھے۔ خود پوپ VIII INNOCENT ("معصوم ہشتم") شہزادہ کو روڈز کے گرانڈ ماسٹر" سپہ سالارِ اعظم سے مذہبی سیاوت کا رعب دے کر حاصل کیا۔ اور جب پوپ کی عدالت میں اِس مذہبی پیشوا کے وہ جعلی خطوط پیش ہوئے جن سے وہ شہزادہ جمؔ کی والدہ سے ہزاروں رقمیں وصول کر رہا تھا تو اِسے اعترافِ جرم کرتے ہی بن پڑی۔ اور پوپ نے پانچ ہزار فلورن لے کر اسے نجاتِ اُخروی کا پروانہ عطا کیا۔ آخر کار رسوائے عالم پوپ الیگزنڈر بورجیا اور شاہِ فرانس چارلس دوازدہم کی شہزادہ جمؔ کی تولیت پر چل گئی۔ اور چارلس نے نیپلز پر حملہ کر کے جمؔ کو پوپ سے چھین لیا۔ مگر پوپ نے شاہ فرانس کو نیچا دکھانے کی خاطر شہزادہ کو خفیہ طور پر زہر دلوا دیا اور اس طرح اِس بیکس اسیر کی جان عذاب سے رہا ہوئی!

— زہر کے معاملہ میں مغربی اور ترک مورخوں میں اختلاف ہے۔ ترک مورخ کہتے ہیں کہ زہر حجام کے استرے سے دیا گیا اور یورپین مورخ کہتے ہیں کہ خوراک میں ملا کر دیا گیا۔

اس غمناک داستان میں فقط ایک خوش کن واقعہ ہے اور وہ یہ کہ جب شہزادہ جمؔ۔ رومیلی میں اسیر تھا تو وہاں کے فرمانروا کی دخترِ نیک اختر فلیپائن ہیلن نے اپنا دل و جان شہزادہ کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ اس علاقہ میں یہ محبت مدتوں ضرب المثل رہی اور شہزادہ کا نام پرنس ZIZMI ہو کر مغرب کی کئی داستانوں میں پایا جاتا ہے۔ شہزادہ جمؔ کا کلام اسکی غمگین اور افسردہ زندگی کا صحیح طور پر ترجمان ہے۔ بایزید کے نام ایک خط میں لکھتا ہے :—

سلیماں را چہ پروا از غمِ مور
فریدوں را چہ باک از ضعفِ زنبور
ہر آں کہ بر لبِ دریا مقیم است
چہ فکر از یک غریبے میرد از دور
تفحّص کن زِ حالِ زیرِ دستاں
دریں گنبد چہ خاقان و چہ فغفور

غرض بندۂ حقیر و افتادۂ بے دستگیر ایں است کہ — بغیر از آستانت

منزلم نیست. بجز اخلاص نکمے در دلم نیست.

غزلیات کا بھی یہی حال ہے۔ آواخر کے کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دل کی ترجمانی ہے۔ یہ تہی رسمی لکھنوی انداز کا ماتم نہیں ——— یہ مطلع سنیئے اور بایزید کا خط پڑھیئے۔ افسوس شہزادہ کو بہت دیر کے بعد آگاہی ہوئی۔ بایزید نے لکھا تھا۔ ایشاں قناعت نہ نمود باغواء غلبۂ ہوس نفسِ امارہ...... الخ۔ شہزادہ جم معترف ہے۔

دریغ در ہوس ایں عمر بے وفا بگذشت
مگر کہ بادِ ہوا بود در ہوا بگذشت

دوسرا شعر کس عاجزانہ قناعت کا حامل ہے۔

غلام ہمت آنم درین جہاں کہ نکرد
نظر بخانۂ گیتی وزیں سرا بگذشت

یورپ کی برف باری کے نظارے جو پہلے پہل ایک عجیب قسم کا جوش پیدا کرتے ہیں شہزادہ جم کو افسردہ تر بنا ڈالتے ہیں۔ اُسی غزل میں ہے۔

چوں برف بر سر کوہے نشستہ موئے بسر
بسر گذشت نظر کن ز سر چہا بگذشت

سواد بوالہوسی تا بکے بگو اے جسم
رسید مدت پیری دم صبا بگذشت

مگر فلپائن کی محبت کی بدولت چند خوشی کے لمحے بھی آتے تھے۔ اور جہاں جہاں اِن کا تذکرہ ہے ان میں ایک عجیب والہانہ انداز پایا جاتا ہے مگر جسم اِس خوشی کی ناپائداری کو جانتا ہے۔ جیسے کوئی ڈوبتا ہُوا ایک تنکے کی طرف لپکے۔۔۔۔۔۔

کجائی اے کہ رویت ہمچو ماہ است
فدائے خاک پایت ہرچہ ماہست
تو رفتی آمدم من بر ہلا کم
بیا اے دوست ورنہ رفتم اندوست

معشوق کی بے نیازی نہیں زمانہ کی بے نیازی پہ کھٹکا ہے۔

چہ باک بہر گلت بلبلاں اگر میرند
ہزار اگر بروصد ہزار می آید

رومیلی میں لکھی ہوئی ایک غزل ہے۔ اس سفید چہرہ سیمیں بدن فلپائن کے متعلق۔

سیمیں تناں کہ طعنہ بروئے قمر زنند
جملہ بہ پیشِ حسنِ تو بر خاک سر زنند

ترک شہزادہ کے منہ سے تیر و تبر کی رسمی باتیں حقیقت سے بعید نہیں معلوم ہوتیں۔

شادم ازاں کہ روزِ قیامت نشانِ ماست
آں غمزہ ہا کہ تیرِ بلا بہ جگر زنند
نگذاشتند تا بہ قدت ہم عناں شوند
آخر بپائے سرو و صنوبر تبر زنند

اور مقطع میں پھر افتادگی اور پریشانی کا ذکر ہے۔

بانگِ اجل قافلۂ عشق در رسید
ہاں اے حجم فتادہ کہ طبلِ سفر زنند

اس اسیرِ فرنگ کو موت ہی میں نجات کی صورت نظر آتی ہوگی۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے

ایک اور مقطع میں حجم فتادہ کی جگہ حجم شکستہ لکھا ہے کہیں حجم افسردہ ہے ایک مقطع میں اپنے انجام پر نظر ڈالی ہے۔ ؎

کس ماتمش نگیرد جز طالعے سیاہش
مسکین حجم ار بمیرد در مسکنِ غریبی

حجم کو موسیقی اور رقص سے طبعی لگاؤ تھا۔ اور غربت میں تو بھی دل

بہلاوا تھا۔ ایک غزل لکھی ہے جو محض رقص اور موسیقی ہے۔ قوافی کا انتظام داخلی ہے۔ ردیف قائم ہے اور تسجیع کے طور پر مصرعوں میں ہر مقام پر قافیہ متواتر ہے۔ جو بدلتا رہتا ہے۔ یہ قدیم صنعت بھی ہے اور جنوبی فرانس کا اثر بھی ہو سکتا ہے۔ ؎

اے دلبرِ مہ پیکر۔ فریاد ز دستِ تو
دے ہے صنمِ کافر۔ فریاد ز دستِ تو

مطلع تو ٹھیک ہوا۔ پیکر اور کافر اور قافیہ فریاد زِ دستِ تو ردیف! مگر دوسرا مصرعہ ہے ؎

من مہرِ تو افتادم آوارہ و ناشادم
ہر گز نکنی یادم۔ فریاد زِ دستِ تو

پھر قافیہ بدلا ہے ؎

بہر تو ہمی پویم ۔ آوارہ ہمی جویم
ہر جائے ہمی گویم۔ فریاد ز دستِ تو

اگر جمؔ کی شاعری جمؔ کے حالات کی آئینہ دار ہے تو بایزید کے جانشین جمؔ کے بھتیجے سلطان سلیم اول کی شاعری اس کی فرخندہ ہمت زندگی کی ترجمان ہے۔ بقول براؤن سلطان سلیم پہلا بین اسلامی بادشاہ ہے۔ اس کی آرزو تھی کہ خارجی فتوحات سے پہلے تمام عالمِ اسلامی کی

ایک متحدہ حکومت قائم ہونی چاہیئے۔ اس نے اپنے باپ کے عہد میں دیکھ لیا تھا کہ سُرخ سر یعنی قزلباشوں کی بغاوت کی وجہ سے مغرب میں اسلامی فتوحات معرضِ خطر میں پڑ گئیں تھیں۔ سلطان سلیمان کے عہد میں بھی یہی ہوا۔ ایرانیوں کے عقبی حملے کی بدولت وی آنا فتح ہوتے ہوتے رہ گیا۔ تاریخ مغربی کے ماہروں نے کئی مضامین IF'S OF HISTORY "جو یوں ہوتا" "تو کیا ہوتا" پہ لکھے ہیں۔ کاش کوئی اسلامی تاریخ کے ایسے موضوعات پر بھی لکھتا۔ مگر جہاں اصلی کارنامے ہی تاریکی میں ہوں وہاں اگر مگر کی نوبت کہاں —— مجھے سولھویں صدی کے ایک فرنگی سپہ سالار کا یہ قول بار بار یاد آتا ہے۔ کہتا ہے "مکمل تباہی اور یورپ کے درمیان فقط ایران کی بہادر فوجیں حائل ہیں"۔ چنانچہ سولھویں اور سترھویں صدی میں ایرانی دربار مغربی سفیروں سے بھرا رہتا تھا —— کاش ایران میں کوئی نادر شاہ جیسا دور اندیش فرمانروا دو صدی پہلے پیدا ہوتا۔ مگر ہم تو نادر شاہ کو بھی فقط ایک خونخوار رہزن کی حیثیت سے جانتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اس فاتح اعظم نے اسلامی جمعیت کی شیرازہ بندی کے لئے ایسے تعمیری کام کئے ہیں جس کی نظیر تاریخ اسلام میں ملنی محال ہے۔ سلیم اوّل اور نادر شاہ بھی وہ نام ہیں جن کی دوربینی قابلِ فخر ہے۔ ہندوستان میں سلطان شہید ٹیپو اس سلسلہ کی آخری کڑی تھا۔ اس کا

نے بھی ایران سے مدد چاہی تھی۔ مگر اس استمداد کے تدارک کے لئے ہندوستان میں شیعہ سُنی فسادات بھڑکا کر شاہ ایران کو بھڑکایا گیا تھا ـــــ یہ ایک اور ہی حکایت ہے، جس کی تشریح آج کی مجلس میں بے محل بھی ہوگی اور شاید خلافِ مصلحت بھی۔

سلطان سلیم نے جب مصر اور عرب کو ترکی سے متحد کر لیا۔ اور باقاعدہ طور پر منصبِ خلافت بھی حاصل کر لیا تو اس کی توجہ ایران کی طرف ہوئی یہاں شاہ اسمٰعیل صفوی نے اپنے مذہبی اقتدار کے قیام کے لئے اسلام میں افتراق و اختلاف کی ایسی خلیج پیدا کر دی تھی کہ اس کے اثرات آج تک محسوس ہو رہے ہیں۔ اور ابن سبا اور صفوی فرمانرواؤں کی دیوانگی کا خمیازہ اسلام آج تک بھگت رہا ہے سلطان سلیم نے ایران کی طرف رُخ کیا اور ایک ہی جنگ میں اس فتنہ کو دبا دیا۔ شاہ اسمٰعیل اپنے اہل و عیال چھوڑ کر بھاگ گیا مگر افسوس سلطان کے جاں نثار سپاہی اس کی بلند ہمتی میں شریک نہ ہو سکے۔ اور تبریز تک پہنچ کر سلطان کو واپس آنا پڑا۔ بعینہٖ جس طرح سکندر اعظم کو لوٹنا پڑا تھا۔ سلطان سلیم نے فقط آٹھ سال آٹھ مہینے اور آٹھ دن حکومت کی۔ مگر اس مختصر دَور میں اس نے ترکی کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنا دیا اور عالم اسلام کے سامنے ایک متحدہ نظام مذہب و ملت

کا نمونہ پیش کر دیا۔ یہ وہی خلافتِ راشدہ کا تصور تھا۔ وہی اسلام کی اخوت اور یگانگت جسے آج بین اسلامیت کہہ کر مقہور و معتوب گردانا جاتا ہے اور حقیقتاً آج بھی اسلامیت کا محض نام لینا یورپ کی بڑ سے زیادہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔

اگر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد
وائے گر در پسِ امروز بود فردائے

سلطان سلیم نے فارسی کو بین الاقوامی زبان سمجھ کر اس میں اشعار کہے۔ اس کی ترویج کی۔ آج ہمارا ملک الشعرا اقبال بھی کہہ رہا ہے۔ لیکن سلطان سلیم نے ترکی کو مردود قرار نہیں دیا تھا۔ اور الحمد للہ کہ اقبال پھر اردو کی طرف متوجہ ہیں۔ اور جیسا انہوں نے مجھے ایک خط میں لکھا ہے۔ اپنا نیا اردو کلام مرتب فرما رہے ہیں۔ آج ترک خود ایرانی اور فارسی سے مایوس ہو کر ایک نئی ترکی زبان کی بنیاد ڈال رہے ہیں جو کوہ قاف وسط ایشیا اور ترکی میں یکساں طور پر سمجھی جائے یہ مقصد سب کا وہی ہے۔ ع

ہر گاہ کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

سلطان سلیم کا کلام ادبی اور تاریخی ہر دو اعتبار سے اہم ہے کئی جگہ تاریخی زندگی کے واقعات کا تذکرہ ہے۔ مثلاً ایران اور مصری حادثات

کے متعلق رجز یہ انداز میں لکھا ہے!

لشکر از تختِ ستامبول سوئے ایراں تاختم
"سرخ سر" را غرقۂ خونِ ملامت ساختم
شد غلامِ ہمتم والئ مصر از جان و دل
نالوائے حروی بر نہ فلک افراختم
کرد از ملکِ عراق ایں مژدہ آہنگِ حجاز
جنگِ نصرت راچو در بزم ظفر بنواختم
ماوراء النہر از تیغم شدہ غرقابِ خوں
چشم دشمن را ز کحل اصفہاں پرداختم

یہ اشعار تاریخی اعتبار سے اہم ہیں اور برٹش میوزیم کے نسخے (NO ADD 7786) میں نہیں پائے جاتے۔ یہ نسخہ نہایت خوشخط لکھا ہوا ہے مگر جابجا اغلاط سے پُر ہے لیکن بچارے جاہل کاتبوں کو کیوں کوسا جائے جب فاضل مُستشرقین خود مضحکہ خیز غلطیوں کے مرتکب ہوں سلطان سلیم کے دیوان ہی کو لیجئے سرآمد مستشرقین مسٹر ریو (RiEU) سے جن کی معرکہ آرا فہرست مسودات مشرقیہ کے دم خم پر ہمارے جدید ہندی محقق پرانے علامہ کے منہ کو آنے لگے ہیں، اس سلسلہ میں عجب عجب بدحواسیاں سرزد ہوئیں ہیں خدا جانے کوئی اور ایسی حرکت کرتا تو

اسے عدالتِ عالیہ تحقیقات جدیدہ سے کیا گیا نہ سزا ملتی۔ مسٹر ریو اوّل تو سلطان سلیم اوّل کے دیوان کو سلیم ثانی کا دیوان قرار دیتے ہیں اور باپ کی جائداد پوتے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اس فہرست میں ریو نے اپنی حمایت میں دو اور نسخوں کا حوالہ دیا ہے ایک بقول ان کے کنگز کالج کیمبرج میں نمبر ۱۶۳ ہے اور ایک قدیم پیٹرز برگ لائبریری میں ہے مجھے ریو کی شہرت اور وثوق کی بنا پہ ابتدا میں بہت تذبذب پیدا ہوا برٹش میوزیم کے نسخے کا بغور مطالعہ کیا خورد بین سے الٹ پلٹ کر، غرض مستشرقین کے جملہ ہتھیار استعمال کئے اندرونی شہادت سے کوئی بھید نہیں کھلتا۔ واضح رہے کہ اس نسخے میں "سوئے ایراں تاختم" والی نظم نہیں میرے نسخہ میں ہے بعد میں ضیا کی "خرابات" میں اسے منقول دیکھ کر تسلّی ہو گئی، پروفیسر گب، آنجہانی کے پاس قسطنطنیہ کا ایک مطبوعہ نسخہ بھی تھا انہوں نے غالباً اسی کی بنا پہ ریو کی اس غلطی پہ "تاریخ ادب ترکی" کی دوسری جلد کے حاشیے میں بوضاحت لکھا ہے مگر دلائل نہیں دیئے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ ریو شاذ ہی غلطی کا مرتکب ہوتا ہے میں نے کنگز کالج کے نسخے کی طرف رجوع کیا تو وہاں اور ہی عالم دیکھا نمبر ۱۶۳ ایک شکاری کے انگریزی میں لکھے ہوئے حالات تھے! تحقیقات سے معلوم ہوا کہ دوبارہ

فہرست بنانے وقت گڑبڑ ہو گئی تھی! یہاں کوئی اڑھائی سو کے قریب مشرقی مسودات ہیں۔ ان کی سرگذشت بذاتِ خود پُر لطف ہے کوئی صاحب لوپٹ تھے ایبٹن اور گنگنہ کے پڑھے ہوئے انہوں نے پٹنے سے آٹھ صندوق مسودات کے یہاں بھیجدیئے اور ایبٹن اور گنگنہ کے کارفرماؤں نے چار چار صندوق (غالباً لاٹری سے) بانٹ لئے یہ ۱۷۹۰ء کی بات ہے۔ جب دیوان سلیم نکلوایا تو اسے اور ہی مضامین پر مشتمل پایا یہ شاہجہانی عہد کا سلیم شاملو طہرانی ہے اگر یہ صاحب ایک نظر دیکھ لیتے تو اس مضحکہ خیز مغالطے میں گرفتار نہ ہوتے گنگنہ کالج کی فہرست میں مرتب نے سلیم کے دیوان سے متعلق کچھ کم دلچسپ مشرقیت سے کام نہیں لیا بیچارہ مثنویوں اور قصائد میں گڈ بڑ کر گیا ہے۔ قطعات کو نہیں سمجھا اور ایک کو دوسرے میں ملا گیا ہے لکھا ہے "یہ دیوان پانچ حصّوں پر مشتمل ہے" بالکل درست! پہلے حصّہ میں بقول فہرست نگار قصائد ائمہ ہیں۔ لیکن اس کا کیا مداوا کہ ان قصائد میں اسلام خان وزیر شاہجہان کے قصائد بھی ہیں اور حضرت علی کے علاوہ اور کسی امام کا نام نہیں دوسرے حصّہ کے متعلق فہرست نگار نے مکمّل خاموشی سے کام لیا ہے اور اگر اس مسلک پر بالعموم عمل کیا جاتا بہتر تھا۔ اس حصّہ میں مختلف قطعات ہیں اور انہیں غالباً

ناکمل نظمیں سمجھ کر قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ تیسرے حصّے کو مثنوی در مدح شاہجہاں قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہاں کم و بیش تین مثنویاں ہیں اور ان میں سے دو مختلف بحور میں ہیں مگر چونکہ آخری میں شاہجہان کا ذکر ہے لہذا حجت ریسیرچ فرما دی گئی۔ سلیم طہرانی کی یہ مثنویاں قابلِ مطالعہ ہیں اور گو عام نظروں میں نہیں لیکن ہندوستان میں ان کے نسخے متداول ہیں ایک سفید مو رعشہ دار بڈھے کے سر کے لئے تشبیہہ ملاحظہ ہو۔ سرش چو شعلۂ شمع سحرگاہ! جی چاہتا ہے کہ سلیم طہرانی کی شاعری پر کچھ اور کہوں مگر آگے ہی یہ بحث بے تعلق ہو رہی ہے۔ چوتھا حصّہ "غزلیات" اور پانچواں "رباعیات" ان دو لفظوں میں چونکہ غلطی کی گنجائش کم تھی لہذا فہرست نگار نے احتراز کیا ہے۔ لیکن یہ مستشرق لوگ بھی خوب دلچسپ ہوتے ہیں مخلص مگر بیوقوف!! یہاں کیمرج میں ایک لیوی LEVY صاحب ہیں۔ ان کی مختصر سی فارسی ادب کی تاریخ HISTORY OF PERSIA یہاں وہاں ہر جگہ متداول ہے ایک ریلوے کے سفر میں نگاہ ڈالی تو صفحہ ۵۹۱ پر محتشم کاشی کے ایک مشہور مرثیے کے ایک بند کے ترجمے میں لکھا دیکھا کہ حضرت حسینؑ کی لاش پر حضرت فاطمہ زہرہ گریاں زناں ہیں حیران ہی رہ گیا زبان نہ سہی یہ لوگ تاریخ تو جانتے ہیں اصل میں "دخترِ زہرا"

ہے چنانچہ میں نے لیوئی LEVY صاحب کو کل ہی اس طرف متوجہ کیا ہے غالباً چائے پہ بلائیں گے۔ دلچسپ گفتگو رہے گی۔ مگر ان لوگوں سے یہ بھی غنیمت ہے سلیم اوّل کو سلیم ثانی بتاتے ہیں مگر الحمدللہ سلیم کے دیوان سے واقف تو ہیں یہ غلط فہرست نہ چھپتے تو ہمیں عمر بھر اطلاع نہ ہوتی بہر حال یہ گنگنہ کالج والا دیوان کسی طرح سلطان کا نہیں ہو سکتا نہ سلطان سلیم اوّل کا اور نہ سلطان سلیم ثانی کا۔ ایک جگہ لاہور کا ذکر جمیل ہے۔ اسی کو شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ ؎

در زمانِ خلافتِ شہ دین
سایہ کردگارِ شاہجہان
ساخت دستور عہد در لاہور
یعنی اسلامخانِ عالیشان
خانہ کز صفائے آئینہ اش
گشت روشن سوادِ ہندوستان

ایک غزل میں پان کا ذکر لذیذ ہے۔ مطلع ہے غور کیجئے۔

یہ پان سر لیست جو در ملک ہند خوباں را
چمن بخون گل و لالہ پرورد پاں را

نمیتواں ز نزاکت دلبر بوسیدن
چوں برگ لالہ لب سرخ ایں سیاہاں را

میں جانتا ہوں پنڈت، سعید اللہ اور ابوالاثر، تبسّم - بدر - واحد منیر اور کئی اور شریر از قسم آذری وغیرہ مسکرا رہے ہوں گے کہ مجھے پان یاد آ رہے ہیں۔ یقین جانیئے کہ اب تو صائب کا وہ شعر ہی یاد رہ گیا ہے جو اس نے " دہن پان خوردہ " کے متعلق کہا تھا یہاں تو عورتیں LIPSTICK سے سُرخی لگاتی ہیں مرد ہونٹوں کو رنگین نہیں کرتے، دیکھئے یہ پھبتی کس کس پر پوری اترتی ہے اور کون کون منہ چھپانے لگتا ہے۔

اس پان اور ہندوستان کے تذکرے کے بعد بھی اگر کسی کو اس سلیم کے متعلق اشتباہ ہے تو وہ ایک اور شعر سُن لے۔ ؎

ز ہند ہر کہ سفر می کند سلیم بگو
سلام ما برساند دیار ایراں را

اور قصائد اور قطعات تو مقامی حالات سے بھرے ہوئے ہیں۔ اب رہ گیا جناب ریو کا بیٹرز برگ والا نسخہ اس کے متعلق اس کی فرانسیسی فہرست مسودات میں بوضاحت سلیم اوّل کا نام معہ سنین حکومت ۱۵۱۲ - ۱۵۲۰ درج ہے میں نے ڈرتے ڈرتے دروس

جو ٹھیرا بھائی !) وہاں کے مہتمم کتاب خانہ کو بھی لکھ دیا۔ غرض مستشرقیت کے چاروں کھونٹیں مساوی کر دی ہیں تو قسطنطنیہ میں کتب خانہ نوری اور حمیدیہ میں نسخے ہیں اور صاحب آنشنگ۔ ہ اور ہیمز اور ڈائیزا س کا ذکر کرتے ہیں اور اگر نہیں کرتے تو بھی بندہ عرض پرداز ہے کہ برٹش میوزیم کا نسخہ سلیم اوّل کا ہے اور کسی کا نہیں —— ہر شعر سے سلیمیت پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہے۔ یہ معاملہ ذوق کا ہے مستشرقیت کا نہیں اور یہ دیمک کی طرح کتابیں چاٹنے سے حاصل نہیں ہوتا لطف خدا داد ہے۔

مجھے اس دیوان کی طرف اس کی فطریت نے کھینچا ہے ورنہ میں اس تمام دردِ سر میں کیوں پھنستا یہ ترک شہنشاہ عجب شخصیت کے مالک تھے قرآن پاک کے IDEAL کے سچے نمونے !! اشداء علی الکفار و رحماء بینہم، وہی جس کی ہمارا شاعر یوں ترجمانی کرتا ہے کہ کامل انسان بزم میں حریر و پرنیاں کی طرح نرم اور حلیم ہوتا ہے اور رزم میں فولاد سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کئی جگہ سلطان سلیم کے اشعار میں بالکل واضح طور پر حالات زندگی پر تبصرہ کیا گیا ہے کھلم کھلا اعلان فتح و ظفر ہے۔ لکھتے ہیں :-

گر لشکرِ عدو شود از قاف تا بقاف
باللہ، ہیچ روئے نمی تابم از مصاف
چوں آفتاب ظلمتِ کفرات جہاں بوم
گاہے کہ صبح تیغ بروں آرم از غلاف
گر نعرہ برکشد زجگہ شیر نر بجنگ
دو زخم دلش بہ سوزنِ پیکانِ جاں شگاف
گر رو برو شود بہ گہہ رزم مدعی
داند کہ نیست دعوئے مرداں زروئے لاف

ایک رباعی ہے۔

من شاخ درختِ سایہ پروردنیم
من ہیچ حریف بادہ و نردنیم
گہ بر سر دشمنان بردر بازو
معجر نہ نہم ہمچو زناں - مردنیم

یعنی اگر زور بازو سے دشمن کو عورتوں کی طرح اوڑھنی نہ پہنا دوں تو مرد نہیں۔ (معجر اوڑھنی کو کہتے ہیں)

غالباً رؔیو کے نسخہ میں یہ اشعار بھی نہیں ـــــ لیکن چھوڑیئے اس تذکرہ کو ـــــ!

نقاد کے لئے دلچسپ وہ مقامات ہیں جہاں شاعر کی شخصیت پردوں پردوں میں جھلک رہی ہو یہ خطیبانہ شعر سے زیادہ نثر کے لئے موزوں ہے ــــــ غزلیات میں بھی جہاں مواتنی مضامین سے کنارہ کشی ناممکن ہے سلطان کا اپنا رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ایک پامال مضمون لیجئے کہ معشوق کے حسن کی تعریف ہر شاعر کرتا ہے اور ہر غیر شاعر بھی ــــــ میں بھی اور پروفیسر منیر بھی اور تبسم صاحب جیسے صوفیائے کرام تو مجاز کو حقیقت سے جا ملاتے ہیں۔

غالباً مولوی رومی نے فرمایا ہے کہ ؎

معشوق بہانہ است و معشوق خدا است
آنکس کہ دو پنداشت بیہودہ نرسا است

لیکن سلیم حقائق دنیوی سے دور نہیں جاتا اور اپنے وقار کو برقرار رکھتے ہوئے کس وثوق سے کہتا ہے اور حقیقت ہیں صحیح انفرادی معیار حسن بھی یہی ہے۔ ؎

سرتا بہ پائے تو ہمہ مطبوع طبع ماست

معمولی مصرعہ ہے مگر شعر ملاحظہ ہو! ؎

سرتا بہ پائے تو ہمہ مطبوع طبع ماست
گویا برائے خاطرِ ما آفریدہ ؛

یہاں "تا" بجائے "تن" کس قدر مناسب ہے، اور "خاطر ما" کے کیا کہنے یہ شعر سلیم ہی کے دیوان میں سجتا ہے گویا برائے خاطرِ ما آفریدہ ٔ!

رسمی صوفیائی کی مجذوبانہ تعلّیاں اور عشقِ الٰہی کے دعوے بھلا تمازیوں کو کس طرح پسند آسکتے ہیں لکھا ہے ؎

چہ افغاں می کنی صوفی کہ سوزِ عشق دارم من
کزیں آتش کہ من دارم ترا از یک شرر سوزد
خوشم کز سوزم صد بار روزے آتشِ ہجراں
کہ وصلش زندہ سازد دیگرم و روزے دگر سوزد

سلیم کی حمد اور نعت میں بھی خلوص اور صداقت کا ایسا جوش ہے کہ ان اصنافِ سخن میں کم پایا جاتا ہے ؎

اے ترا پردۂ عزت علمِ یکتائی
کس نہ ہمتائے تو در مملکتِ ہمتائی
ہیچ بے امرِ تو از بندہ نیاید امرے
من بہ امرے تو کنم ہر چہ مرا فرمائی
بادشاہا بہ سلیمی کہ گدائے درِ تست
دانشی بخش کہ افزوں بود از دانائی

ایک غزل کا مقطع ہے۔ ؎

تسلیم خصیم سیاہ دل چہ داند ایں حالت
کہ از ظہور الٰہی ست فتح لشکر ما

غزل میں سلیمیت چھپائے نہیں چھپتی اور ذاتی تشخص نمایاں ہو کر رہتا ہے دیکھئے معشوق سے بھی ٹھن گئی ہے۔ اور مقابلہ کا دعوےٰ ہے۔

؎ در حسن گرچہ یار ندارد نظیر خویش
در ملک عشق نیز نباشد نظیر ما

اور کس قدر بلند تشبیہات ہیں۔

؎ نلاب ماہِ نو بود دوارِ آسمان
روز قضا بمعرکہ دارو گیر ما

اس کا مطلع ہے وہی رزمیہ انداز وہی برابر کی چوٹ۔

؎ آہست و نالہ از سینۂ غم نفیر ما
اے ترک شوخ چشم نذر کن زیر ما

یاد رہے کہ یہاں ترک شوخ چشم اردو شعرا کی طرح نادیدہ حسن کی تعریف نہیں یہ WHEN A GREEK MEETS A GREEK والا معاملہ ہے اور پھر سلطان سلیم کے سامنے تو دنیا جہان کے خزانے کھلے ہوئے تھے ـــــ چنانچہ جہاں کہیں حسن کی ترغیب اور جمالیاتی

احساسات کا ذکر ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ غریب ہندی شعرا کی "خواب و خیال" کی دنیا نہیں محض رومان کا دھندلکا نہیں بلکہ ایک اہلِ نظر جوہری کی شناسا آنکھ ہے جو کھوٹے اور کھرے کو پرکھ رہی ہے۔

دیکھئے، کیسی دشوار زمین میں کیسی واضح تصویر کھینچی ہے بالکل چلتی پھرتی "ترک شوخ چشم" کی تصویر جوانی اور الھڑ پنے کا عالم ہے اور شراب کی مستی ہے۔ سروقامت معشوق لڑکھڑاتا ہوا ٹیڑھا ترچھا چلتا ہوا آرہا ہے۔ دامن جہاں سے اُٹھ گیا ہے ویسا ہی ہے اور ٹوپی ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی ہے تابشِ شراب و شباب سے چہرہ گلاب کی طرح دہک رہا ہے اور سیاہ زلف خم کھاتی ہوئی ٹیڑھی ٹوپی کے گوشے سے باہر نکل رہی ہے۔ ؎

سرمست دگر میرود آں سرو بروہ کج

دامن سیاں سرزدہ بنہادہ کلہ کج

از آتش مے روئے برافروختہ چوں گل

وازطرف کلہ کردہ بروں زلف سیہ کج

ایک ایسی ہی رقصاں و افتاں غزل ہے ـــــــ سامنے ایک بت طناز گزر گیا ہے منہ بنا کر بوسے کا لالچ دے کر جلدی جلدی قدم

اٹھاتا ہوا۔ ذرا ہمت کر کے دامن میں ہاتھ ڈالا تو جھٹ پٹ پلٹ کر بصد ناز دانت سے کاٹ لیا۔ اور چل دیا اب زور کی جائے تو کیسے اور چپ رہا جائے تو کیونکر۔ ؎

یارِ آمد بسرم مست و خراماں و رود
نارسانده به لبم لب بر دمِ جانِ و رود
چہ بلائے کہ چو در دامنِ او آویزم
کفِ دستم گزد از ناز بدنداں و رود!

غرض تمام کلام پست بلند ایک منفرد شخصیت کا آئینہ دار ہے جہاں کہیں رسمی مضامین معلوم ہوتے ہیں وہاں محرکات کا اختلاف نظر آتا ہے۔ فارسی شعرا سب کے سب دشنام کے خواہاں ہوتے ہیں۔ "بوسۂ چند بیامیز بدشنامے چند" کی گلقند ہر کسی کو مرغوب ہے غالباً ہم تم میں یہ خواہش پست ہمتی وغیرہ کا نتیجہ ہوتی ہوگی لیکن کیا ایک باجبروت شہنشہ پہ جسے خلوت میں بھی جلوت کی درباداری نظر آئے، ایسے لمحات نہ آتے ہوں گے جب وہ چاہتا ہوگا کہ اس کی شہنشاہیت کو بھلا دیا جائے اور اسے اس کی اپنی خاطر برابری کے ساتھ چاہا جائے ——— یہ وہ مقام ہے جب سلام ریاکاری

معلوم ہوتا ہے اور دشنام میں اپنائیت پائی جاتی ہے۔ سلطان سلیم لکھتے ہیں۔ ؎

دشنام تلخ از لب شیریں خوش ست لیک
مشکل حکایت است کہ آسان نمی دہد!

اس مطالب و معانی کی بحث میں سلطان قدرت زبان کی طرف توجہ دلانا نظر انداز ہو گیا ـــــ اور یہ ہے بھی تحصیل حاصل ـــــ معانی اور بیان میں فرق ہی کیا ہوتا ہے اور اتنے اشعار سننے کے بعد اب اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ مشکل زمینوں میں چند غزلیہ اشعار سنا کہ اس لذیذ حکایت کو مختصر کرتا ہوں۔ ؎

آں تند خو زلف بدل تازیانہ زد
جان از فراق سوخت کہ بر من چرا نہ زد
از خان دماں گگو بہ سلیمی سخن کہ او
ادل بجود زد آتش دد یگر بخانہ زد

پس منظر ہے ؎ خزاں کا اندر چمن ہا بہ گھائے زرد می بارد
نثار قبر فسمہا دِ یلا پہ ورد می بارد

جوانمنی ؎ تنم افگار شد از تیغ غم افگار تر بادا!
بلا د محتمم بسیار شد بسیار تر بادا!

غمِ عشقش کشیدن تا نباشد ہر کسے آساں
چنیں امروز دشوار است زیں دشوار تر بادا

میں خاتمہ کلام پر آپ کی توجہ پھر اس امر کی طرف دلاتا ہوں کہ ترکی یہ سلاطین اور ان کے جانشین بزم و رزم دونوں میدانوں کے مرد تھے ان کی فتوحات علمی بھی ہیں اور ارضی بھی۔!

اگر اس گفتگو سننے کے بعد کسی ایک دل میں بھی تاریخ و ادب کے ان گمشدہ اوراق کی شیرازہ بندی کی خواہش پیدا ہو گئی تو میں سمجھوں گا کہ مجھے اپنی سرگرانیوں کا پورا صلہ مل گیا اور جو یہ بھی نہ ہوا تو آج کی ملاقات اور تبادلۂ خیالات ہی کچھ کم قیمت نہیں کہ میں اس دولت پر قناعت نہ کر لوں۔ عرفی نے کس قدر صحیح کہا ہے۔

نہ کوتہی ز عطا بود عشق می داند
کہ بہرکہ شمۂ ما تنگ بود خلوت طور

تاثیر

کیمبرج۔

کیمبرج

۱۹ ر اپریل ۳۴ء

عزیزم - السلام علیکم - پچھلے ہفتے خط لکھنے بیٹھا تو خیالات کی رو کہیں اور ہی لے گئی - اُس خشک پلندے پر تم یقیناً جھلا ئے ہو گے مجھے اس خامی کا اعتراف ہے لو اس کا ازالہ کئے دیتا ہوں - میں نے اشعار کا وعدہ کیا تھا - سات ہو گئے ہیں - لکھے دیتا ہوں - کافی ہوں گے اور ہوں گے تو لکھوں گا ـــــــ پہلے دو شعر پرانے ہیں مگر غیر مطبوعہ معلوم نئے ہوتے ہیں -

میرے ہمدم مرے احباب ہی ہیں طعنہ زن مجھ پہ
کمانیں لے کے چڑھ آئے مرے ناوک فگن مجھ پہ
نہ ہے جوشِ نمو تا نم ہیں رنگ و بو کی دیواریں
گلوں نے خار بن کر بند کی راہ چمن مجھ پہ

(چمن کا لفظ عام ملک پر اطلاق کرتا

ہے۔ یہ شعر ذاتی نہیں عام ہے)

خبر ہوتی تو کیوں گاتا ترانے شادمانی کے
چمن سے دور ہو کر اب کھلا راز چمن مجھ پر

(یہاں وطن کی ذلت اور غلامی کی
جراحت نہیں مگر راز کے کھلنے
پر ہوا یہ کہ شادمانی کے ترانے
بے محل نظر آنے لگے مستقبل تاریک
معلوم ہونے لگا)

یہ خود اپنے لئے صیاد ہیں میں صاف کہتا ہوں
خفا ہی کیوں نہ ہو جائیں مرے اہلِ وطن مجھ پر

(اس مصرعے میں نثر کی سی صاف گوئی ہے)

جھکی پڑتی ہیں شاخیں گل کھلے جاتے ہیں مستی میں
بہار آئی فدا ہونے لگا سارا چمن مجھ پر

(یہاں آجکل موسمِ بہار ہے)

یہ رنگین تیتری وہ گل بدامن نغمہ زن بلبل
ہر اک جانب سے دام افگن ہوتے ہیں سحر فن مجھ پر

(دامن۔ زن۔ افگن۔ فن خارجی اور داخلی

قوافی ہیں۔ یورپ کی دلکشی کا اثر ہوتا
ہُوا نظر آتا ہے۔ قیاس ہے، کہ..... جیسا

مجھے معلوم ہے ان عارضی رنگوں کی کیفیت
اثر کیا کر سکے گی ان کھلونوں کی چبھن مجھ پہ

"——یعنی شاعر اپنے توازن کو حاصل
کر لیتا ہے۔ رنگ و بو کی خارجی لغزشیں
اس کی روح پر کامرانی نہیں پا سکتیں"

میری ان تشریحات پر تم جھنکو گے۔ فقرہ بازی کرو گے۔ کہو گے دماغ
چل نکلا ہے۔ اتنی تعلّی! ۔ بھائی میرا مقصد دل لگی کے سوا کچھ نہیں۔
ورنہ یوں تمہیں خوش کرنا اور اندازِ تنقید سے آگاہ کرنا بھی مقصود ہے

——تم تو بھول چکے ہو لیکن میرے دماغ میں تمہاری "تاریخ ادب
اردو" اب تک ہے شاید کبھی لکھ ڈالو۔

ہاں وہ "کلچر گوتم" کا جو تذکرہ بدھ کے خط میں کیا تھا وہ ذرا کچھ
بات بھول گئی ہے۔ انہوں نے ایک خاص نمبر کے لئے مضمون مانگا۔
اور کہا سوموار تک پہنچے۔ ہم ہندوستانی اخبارات کے عادی۔
سوموار کو لکھا منگل کو ٹائپ کرایا۔ اور آخر بدھ کو ان تک پہنچایا۔
وہ کچھ ایسے ہی مرعوب ہو گئے کہ گو خاص نمبر میں نہ چھاپ سکے مگر بعد

کے نمبر میں چھاپ رہے ہیں حالانکہ چند صفحات کے پرچے میں اس غیر معمولی موضوع کے لئے جگہ نکالنا مشکل تھا۔ کوئی پندرہ سو لفظ ہیں۔ شاید ساتھ ایک آدھ تصویر بھی ہو۔ میری نہیں موضوع سے متعلق چیزوں کی ——— عنوان ہے "برطانوی تصویروں کے ہندوستان میں امکانات" میں نے "سن آف انڈیا" کو رگیدا ہے۔ کیا تم ایشیائی موضوعات کی فلموں میں جو غلطیاں ہوتی ہیں۔ عادات۔ لباس۔ رواج۔ نقطۂ نظر کی ——— ان پر بشرح لکھ کر دے سکتے ہو؟ تم نے بیسیوں دیسی بدیسی فلمیں دیکھی ہیں اور ہندوستانی فلمکاری کے متعلق قلم درازی بھی کی ہے۔ اگر لکھ سکو تو مضمون نگاروں کے زمرے میں نام درج ہو سکتا ہے۔

میری باتیں نوٹ کر لیا کرو۔ تم بھول جاتے ہو اور میں دور بیٹھا جھلاّتا رہتا ہوں۔ بزم کی کتابیں۔ عمر خیام۔ عطر جوہی۔ تمباکو خوردنی۔ (بھائی وہ نہیں ملتا تو چلو قوام ہی سہی) یہ چار فرمائشیں تھیں۔ تم سے ایک بھی پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ یہ بوجھ بانٹ لو۔ مگر کوئی اور کیوں پھنسے گا اس مصیبت میں جبکہ تم ہی جان بچا رہے ہو۔

ہاں لو اوپر والی غزل میں تین شعر اور ہو گئے ہیں۔

حالیہ ہیں۔

مجھے شعروں سے کیا نسبت مجھے بخشوں گی کب فرصت
توجہ صرف فرماتے ہیں کیوں ارباب فن مجھ پر
کہاں اشعار کی باتیں کہاں یہ پیار کی باتیں
سراسر افترا ہے دعوئے شعر و سخن مجھ پر
میں اور رودادِ غم! اس بزم میں یہ کون مانے گا
نہیں تاثیر پھبتا جامۂ رنج و محن مجھ پر

اگر یہ غزل بزم کے جلسے میں لے اُڑو۔ تو پھر اسے سلطان مقصود سے پڑھوانا۔ گو اُس نے بھی مالکوس کے سوا کچھ نہیں سیکھا مگر اسی ایک کو اپنی طرف سے حدِ کمال تک تو پہنچانے کی سعی کی ہے۔ آغا حشر کا سا حال ہے۔ ان کے ہاں غیض و غضب۔ جوش و خروش۔ شادی و غم۔ مسرت و ابتہاج کے لئے ایک ہی رنگ کا مکالمہ روا ہے۔ "نوحۂ غم" اور "نغمۂ شادی" کے لئے ایک ہی انداز کے فقرے ہیں ہیں مقصود کے پاس بھی وفات و ولادت کے لئے اسی مالکوس کی نفیری ہے۔ مگر بھئی خواہ کچھ کہو یہ تو ماننے ہو ناکہ اس نفیری کو بجاتا خوب ہے۔

لو اب ختم کرتا ہوں ——— شام ہوتی جا رہی ہے۔ سورج کی آخری کرنیں دریا کے پانیوں میں سونے کا عکس ڈال رہی ہیں۔

اس خط کو ختم کرنے کے بعد میں ذرا سیر کے لئے نکلوں گا۔

فقط والسلام

مخلص تاثیر

ہمبروک کالج

کیمبرج

۲۵ر اپریل سنہ ۳۴ء

عزیزم۔ السلام علیکم۔ بات ہوئی نا۔ ایک فیصلہ کن جواب دیا۔ تم اس سال نہیں آرہے ہے۔ بہت اچھا۔ مجھے اضطراب اور غصہ محض تمہارے "بے پیندے پن" پر تھا۔ اس کی بدولت مجھے یہاں کے صاف گو لوگوں کے سامنے اچھا خاصا کھسیانا ہونا پڑا۔ لیکن اگر اگلے سال ہی کی نیت ہے۔ تو پھر کیا سوچ رہے ہو ابھی سے درخواست کیوں نہیں بھجوا دیتے۔ اس طرح اچھی جگہ مل جائے گی اور یقینی فیصلہ ہو جائے گا۔ عزیز من یہاں انگریز طلبہ اسی فیصدی نامنظور کر دیئے جاتے ہیں۔ جائے تنگ است و مرداں بسیار —— اور ہندوستانی تو بیچارے محض برائے بیت ہوتے ہیں۔ استعماری تعلق کی خاطر!

شکر ہے کہ تم جاگے۔ فروغ اردو کی کتابیں بھیجنے کی نیت باندھی تھی۔ لیکن ابھی نیت ہی ہے۔ خدا تمہارے حال پر رحم کرے۔ مجھے دیگر اشیائے کے متعلق زیادہ امید ہے۔ تمباکو کھاتا نہیں کھلاتا ہوں ــــ کس کو؟ اب یہ تم کیوں پوچھتے ہو۔ عطر کی ضرورت ظاہر ہے۔ اور "عمر خیام" کے تو یہ سب لوازمات ہی ہیں۔ اب کہیں میرے اس اندازِ تحریر سے یہ بہانہ تلاش نہ کرلینا کہ آپ نے متانت سے نہیں لکھا تھا لہٰذا کچھ نہیں بھیجا گیا۔ اور ہاں بھئی یہ لکھنؤ کی بجائے قنوج اور دہلی کی کس بدمذاق نے صلاح دی۔ بدر نے تو لکھنؤ سے منگانے کو کہا تھا یا تم مجھے ٹرخانے کی نیت سے اس ذرا سی بات کے لئے مجلسِ شوریٰ قائم کر رہے ہو۔

تم میرے نہ بدلنے پر شاکی ہو۔ اور میں اپنے آپ سے اپنے بدل جانے پر ناراض۔ یعنی بالکل طالبعلمانہ خوشیوں کا حامل ہونا چاہتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ مجھے پی۔ ایچ۔ ڈی میں نہیں بلکہ ایم لٹ کے لئے لیا گیا تھا۔ اور میں اسیرِ مضطرب تھا۔ کیونکہ معلوم یہ ہوا تھا کہ انگلش فیکلٹی نے بالخصوص فیصلہ کر رکھا ہے کہ کسی اجنبی کو خواہ وہ امریکی ہو یا ہندوستانی پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے براہِ راست نہیں لیا جائے گا۔ اور اس فیصلے میں اوکسفورڈ اور کیمبرج دونوں شریک تھے۔

لیکن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ہمارے Q صاحب ہم پر مہربان ہو گئے اور پہلی ٹرم کے اختتام پر خود ہی فرمانے لگے کہ کیوں بھائی تم پی۔ایچ۔ڈی ہی کر رہے ہو نا؟ اور پھر سوال و جواب کے بعد ارشاد کیا کہ بندہ عرضی داغ دے۔ سو پرسوں اِس خاکسار کو ایم لٹ کے ڈبے سے نکالکر پی۔ایچ۔ڈی کے ٹاپ میں بند کر دیا گیا ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بلکہ یوں کہو کہ ذالک فضل اللہ... وما توفیقی الّا باللہ۔ سو تم اب اِس بات پہ مٹھائی کھلانے سے تو رہے گولی نفترہ ہی کھلا دو۔

طارق کا خط نہیں آیا۔ کیا کر رہا ہے۔ مقصود۔ ابوسعید۔ آذری بشیر اور ناظم کس دھن میں ہیں۔ لو اور سنو۔ بدر نے پوچھ بھیجا ہے کہ سینئر کیمبرج کا امتحان دے کر انگلستان میں کیا کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ بھئی یہ لاہور میں کیا ہو رہا ہے۔ ہر شخص کی سینئر کیمبرج اور انگلستان پر نظر ہے۔ دونوں کی خبر نہیں۔ میں بھی فرنچ پڑھنے لگا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ لاہور سے کوئی صاحب سینئر کیمبرج کی سند لئے یہاں آن دھمکے تو میں پیرس میں نقل مکانی کر لوں گا بلکہ اس لئے کہ یہاں کے

ریسرچ بورڈ نے وظیفہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔

تم خود تو مضمون کی کمی کی شکایت کرتے ہو اور مجھ سے لمبے خط لکھنے کا مطالبہ کر رہے ہو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ اگر بحری ڈاک کی نیت ہے تو بہت اچھا۔ دولت کی بچت ہوگی۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم سے یہ سلسلہ ٹوٹ جائے گا اگر وعدہ کرو کہ کسی ہفتے خط لکھنے میں کوتاہی نہ ہوگی خواہ "ہنی مون" ہو اور ضروری امور ہوائی طریق سے طے ہو سکیں تو بحری ڈاک کا سلسلہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مجھے واقعی فائدہ ہوگا۔ اور میں یہ نہیں چاہتا کہ تم اس شرم میں مارے جاؤ کہ میں کہونگا کہ تم تھک گئے ہو۔ نہیں عزیز من تم ہنسی میں بھی یہ نہ کہا کرو کہ مجھے تمہارے متعلق شک وشبہ کی گنجائش ہے۔ اچھا تو آج سے بحری ڈاک۔ مگر اس خط کا جواب ہوائی ہو۔ میں خود بحری شروع کر دوں گا تاکہ تمہیں کسی طرح الزام اپنے اوپر آتا دکھائی نہ دے۔ آج ۲۵ر ہے یہ خط ۲۸ر کو کراچی ایڈن سے جہاز میں اڑے گا میرے حساب کے مطابق ۵ رمئی کو تمہیں ملے گا۔ تم ۶ر کو لکھو تو ۱۲ تک مجھے جواب مل جائے گا۔ میں چودہ کو بحری ڈاک سے لکھوں۔ تو تمہیں جون کے پہلے ہفتے میں خیریت کی خبر مل جائیگی۔

توچلو آج سے ہوائی بندہ بحری شروع۔ ۶
جا چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر

فقط والسلام
مخلص تاثیر

کیمبرج

عزیزم السلام علیکم۔ کل ڈاک آئی اور تمہارا خط پھر نہ ملا تو سخت مایوسی ہوئی۔ خیال یہ تھا کہ شاید تمہارا خط کالج کے پتے پر چلا گیا ہو گا وہاں گیا لیکن تم نے لکھا ہوتا تو ملتا۔ ناچار واپس لوٹ آیا۔ تم جانتے ہو لاہور سے جو خط آتے ہیں وہ میرے لئے آیۂ رحمت ہوتے ہیں۔ پھر تمہارے گپ باز خطوں کو میں بطور خاص پسند کرتا ہوں اس لئے کہ تمہارا خط تمہاری اصل کیفیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ بدر تمہیں اگر نقشبند کہتا ہے تو اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں۔ جو نقشہ کشی تم انسانوں کی کرتے ہو وہ مصوری کی حد کو پہنچتی ہے۔ اس لئے تمہیں چاہیئے کہ کسی ڈاک سے ناغہ نہ کرو۔

ابھی ابھی میں نے ایک اشتہار دیکھا ہے۔ معارف پریس سے اردو شاعری کا ایک انتخاب چھپا ہے "بہار" کے نام سے۔ جو تفصیل میں نے یہاں دیکھی ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کتاب واقعی اچھی ہو گی۔

گو تم نے ابھی تک پہلی چیزوں میں بھی کئی ایک نہیں بھجوائیں لیکن کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ "بہار" کی ایک نقل بھی بھجوانے کا انتظام کر دو۔ تمباکو خوردنی مل گیا تھا۔ بہت پسند آیا۔ شکریہ۔

آجکل مصروفیت کافی ہے لیکن پچھلے ہفتے تمہارا خط نہ پا کر طبیعت بہت افسردہ ہوئی تو دفع الوقتی کے لئے تحریر کی طرف متوجہ ہوا۔ پہلے اسلامی تاریخ پہ ایک سکیم سوجھی اور اُس کا ڈھانچہ بنایا لیکن چونکہ وہ کام ذرا مشکل تھا اس لئے اس کے اجمال میں نے محفوظ کر لئے ہیں کبھی موقع ملا تو ان پہ کام کرونگا۔ غالب کا دیوان دیکھا اس نیت سے کہ اس کے اشعار کی مدد سے میں اس کی زندگی کے بعض واقعات کو ڈرامائی رنگ میں لکھنا چاہتا تھا۔ اتنے میں ایک بزرگوار تشریف لے آئے۔ باتوں باتوں میں دنیا جہاں کے مسائل پہ بحث ہو گئی۔ آخر معاملہ روس پہ ٹھہرا۔ وہ اپنی ہانک رہے تھے میں اپنی کہہ رہا تھا۔

تاثیر

کیمبرج

۵ر جون ۱۹۳۴ء

عزیزم - السلام علیکم - اب کے پھر ہوائی ڈاک میں تمہارا خط نہیں ملا - میں تو ہمیشہ کے لئے مایوس ہو چکا تھا لیکن تمہارا ۱۷ر مئی کا لکھا ہوا بحری خط ۴ر جون کو ملا - اس میں ہوائی ڈاک چھوٹ جانے کا قصہ تھا - نہایت حیرت ہوئی کہ بحری ڈاک اتنی جلدی کیسے پہنچ گئی - کیونکہ جو ہوائی ڈاک یہاں پچھلے ہفتے پہنچی ہے وہ لاہور سے بہرحال ۲۰ر مئی کے بعد چلتی ہے - مگر تم نے ۱۷ر مئی ہی کو پیش گوئی فرمادی - یا شاید اب آئندہ ہفتے بھی ناغہ کرنے کا ارادہ ہے ——— یا شاید ...... لیکن یہ سارا قصہ طلسمات ہوشربا ہی رہے تو اچھا ہے -

مجھے افسوس ہے کہ میرا پچھلا خط بیرنگ ہو گیا - آئندہ محتاط رہونگا - دراصل بات یہ تھی کہ میں جب خط لکھنے بیٹھا تھا تو کوئی مضمون سامنے

نہیں تھا۔ لیکن جب خط کا زاویہ بدل گیا اور دو صفحے لکھے جا چکے تو دل کھری کھری باتیں کہنے کو چاہنے لگا اور میں نے پورے پندرہ صفحے ایک سانس میں لکھ مارے۔

بزم کے مضامین کی فہرست ملی۔ دیباچہ تو لکھ دوں مگر بھائی تمہارے خط سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کہ کون واقعی کیا لکھ رہا ہے۔ مثلاً "اُردو مرثیہ" کے متعلق شاید لکھا ہے۔ کسی اور کے متعلق محض امید کا اظہار کیا ہے حمید احمد خاں کے مضمون کے متعلق صرف توقع بتلائی ہے کیا ممکن نہیں کہ قطعی فیصلہ ہو جائے۔ اس لیے دوبارہ سوچ کر لکھو۔ ہوائی ڈاک سے :-

(۱) کتاب کب چھپ رہی ہے۔

(۲) کون کون سے مضمون قطعی طور پر شامل کئے جا رہے ہیں۔

(۳) دیباچے کے پہنچنے کی آخری تاریخ کیا ہے۔ اس میں بال، ہٹ مت کرو۔ مجھے ۹ ر جون کو اس ٹرم کا آخری مرحلہ طے کرنا ہے پھر تین چار دن کے بعد لندن جانا ہے۔ وہاں برٹش میوزیم کے ارد گرد بیشتر حصّہ گزارنا ہے۔ اور ہفتہ دو ہفتہ شاید سمندر اور فرانس کی سیر اور مطالعہ پر صرف ہوں۔ لہٰذا

(۴) دیباچے کو جون کے آخری ہفتے پر ملتوی کر دو۔

(ب) میرا پتہ جب تک، مزید اطلاع نہ ملے یہ ہوگا۔ معرفت ڈاکٹر

اے ایم شاہ ۲۸ برج روڈ۔ بیٹرسی۔ لندن۔

اصل پتہ اپنی مستقل رہائش کے بعد لکھوں گا۔ اگر یہ تفصیل یاد نہ رہے تو کالج کے پتے پر بھیجتے جاؤ۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ اس پتے کو ذہن میں رکھو۔ خدا جانے میں کہاں کہاں خوار ہوتا پھروں۔ فی الحال رسل سکوئر کا ارادہ ہے۔ مگر وہاں کی بھیڑ بھاڑ سے تنگ آجاؤنگا تو شاید گولڈرز گرین یا کلیپہیم چلا جاؤں۔ اس لئے مندرجہ بالا پتہ ٹھیک ہے۔ گھر والوں کو بھی میں نے یہی لکھا ہے۔

تم نے فلموں کے سلسلے میں ایک ہندی فلم کے متعلق تفصیل سے تو لکھ دیا لیکن اب میں اس کے خلاف یہاں آواز کس طرح اُٹھاؤں اوّل تو میں نے فلم دیکھا ہی نہیں تمہاری روایت پر لٹھ گھمانا حماقت ہوگی! پھر یہ چیز اتنی پرانی ہے کہ اسے یہاں کوئی درخورِ اعتنا تصور نہیں کریگا۔ نہ بابا مجھ سے یہ تمہاری تبلائی ہوئی "بھارت ماتا" کی خدمت نہیں ہوسکتی اور میں ہندوستان پر احسان نہیں کر سکتا۔

عطر کا انتظار ہے۔ کہیں یہاں سے لندن ہجرت کر چکنے کے بعد نہ ملے۔ اگر ابھی تک نہیں بھیجا تو لندن کے پتے پر بھیجو۔ اور ہاں دیکھو ابوالاثر۔ منیرالدین۔ غلام حسین۔ سعیداللہ، واحد، بادر، طارق، مقصود

اور آذری کو میرا پتہ بتلا دو۔ اگر درکار ہو تو ——— یا رہنے دو۔ میرا اس فہرست سے مطلب ان لوگوں کے نام گنوانا تھا جن سے خطوط پہنچتے ہیں ——— یا متوقع ہیں ——— مگر تمہارے سوا خبریں کوئی نہیں بھیجتا۔ تاثرات پر زور رہوتا ہے۔ اور میں خبریں چاہتا ہوں ——— گو تاثرات بھی!

بشیر ہندی [۲۳] اور حشر کے مقدمے کا حال معلوم ہوا۔ بڑی دلچسپ چیز ہے۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ اس مقدمے میں ہندی کو کوئی نقصان پہنچ سکے۔ ہندی بہر حال وہی کچھ رہے گا جو اب ہے یا پہلے تھا۔ ایسے مقدمے اُس نے بیسوں لڑے ہیں۔ البتہ مصالحت ہو جاتی تو بہتر تھا۔

تم نے "نگار" [۲۴] کا تذکرہ کیا ہے لیکن ایسے دلچسپ موضوع کی طرف متوجہ کر کے پرچہ نہ بھیجنا بے حد بے رحمی ہے۔ بلکہ سفاکی ——— یا تو تمہیں چپ رہنا چاہیئے تھا یا اب لکھا ہے تو پرچہ مہیا کرو۔ ایسا کرنا کونسا ہفتخواں طے کرنا ہے جو سوچوں میں پڑے ہو۔ ؏

کیا کریں عاشقی میں کیا نہ کریں

مگر بھئی تمباکو خوب تھا۔ لوگ مست ہو رہے ہیں۔ اگر لکھنؤ سے اور آگیا ہے تو اسی مقدار کا اور بھیج دو۔ ورنہ جانے دو۔ مگر نگار کی کاپی ضرور بھیجو میں دیکھنا چاہتا ہوں۔

طارق کا ایک خط آیا تھا۔ اسے بھی تمہارے ساتھ ہی جواب دے رہا ہوں بلکہ تمہارے لفافے میں بند کر رہا ہوں۔ یہ اُس تک پہنچا دینا۔ یا بابر کو ٹیلیفون پہ اطلاع کر دینا وہ طارق کو خبر کر دیگا۔

فقط والسلام

مخلص تاثیر

کیمبرج
۱۲ر جون ۱۹۳۴ء

عزیزم - السلام علیکم - تمہارا خط ملا - دلچسپ تفصیلات معلوم ہوئیں - آموں کی بہار کا تذکرہ کر کے تم نے مجھے وطن کے لئے تڑپا دیا اس پر بارشوں کی دلفریب کیفیت کا ذکر مزید تازیانہ ثابت ہوا - اچھا بھئی خوش رہو -

یہاں بھی اب موسم خوشگوار ہو رہا ہے - میرا حلقہ بڑھ گیا ہے - دو تین بزرگوار خاص طور پر مہربان ہیں اور چند ایک علمی مجالس میں آنا جانا ہے - اور پھر اپنا کام اتنا خطرناک طور پر وسیع ہے کہ الاماں - غرضیکہ وقت اچھی طرح گذر رہا ہے اور میں خوش ہوں کہ گذر رہا ہے جلد جلد گذر رہا ہے " پیچ میں نہیں کھڑا " ——— یہاں ایک "کاسموپولیٹن" سینما ہے جو محض کانٹی نینٹل فلمیں منگاتا ہے وہاں شام اچھی گذر جاتی ہے پرسوں "بلیو لائٹ" یعنی ریفنسٹال جرمن فلم دیکھا - پہلی عجیب تصویر

دیکھنے میں آئی ۔ یہ عورت یہاں ایک لیکچر بھی دے گئی ہے ۔ خود ڈائرکٹ کرتی ہے اور ایکٹ بھی ۔ آج کل یہاں بہت چہل پہل ہے ۔ یورپ اور امریکہ سے لوگ جمع ہو رہے ہیں ۔

کل کا پروگرام سن لو ۔ پرسوں رات پیلیپرز سوسائٹی میں نیو سٹیٹسمین کے ایڈیٹر کی بات چیت تھی ۔ نہایت لذیذ ۔ بعد میں بحث شروع ہو گئی ۔ موضوع تھا "اخبارات کے رجحانات" ۔ اسی بحثا بحثی میں رات کے دس بج گئے ۔ باہر نکلے تو بدمست "انڈر گریجویٹز" کے ٹولے پھر رہے تھے ۔ امتحان ختم ہو رہے ہیں ایسے موقع پر یار لوگ پی کر اندھے ہو جانے کو تھوڑا سا فیشن سمجھتے ہیں ۔ خیر ہم ایک کیفے میں چائے پینے کی نیت سے جا بیٹھے ۔ یہاں ایک دوست کی دوست بھی شریک ہو گئیں ۔ مگر انہیں چونکہ یونیورسٹی کے ضابطے کے ماتحت گیارہ بجے مقفل ہونا پڑتا ہے اس لئے بھاگیں ۔ جلدی میں جانے سے موچ آ گئی ——— یا جھوٹ تھا ——— ہم دو کو کاندھا دینا پڑا ۔ بیس منٹ کی مسافت اس بری طرح کاٹی کہ یاد رہیگی ۔

آج صبح ساڑھے نو بجے بستر سے نکلا ۔ نہایا ۔ منہ مونڈا ۔ ساڑھے دس ناشتے کی میز کو صاف کیا ۔ گیارہ سے ایک تک کتب بینی کی ۔ پھر سامنے کے محلے میں ایک واقف ہیں جرمن طالب علم ۔ ان کے

ہاں گپ زنی کی۔ ڈیڑھ بجے واپس آ کر لنچ کھایا۔ ایک گھنٹہ پڑھا۔ اڑھائی بجے یونٹی لیگ کا جلسہ تھا وہاں "مس ماسٹرمین" کا پرچہ تھا۔ سُنا، داد دی۔ سوالات جوابات ہوئے۔ اس لڑکی کو ہندوستان اور ہندوستانیوں کے متعلق بے حد حسنِ ظن ہے۔ لارڈ بائرن کے خاندان سے ہے۔ باپ سوشلسٹ پارٹی کی طرف سے پارلیمنٹ کا رکن تھا۔ نانا ہندوستان میں گورنری کر چکے ہیں۔ بہنوئی یہاں استاد ہے۔ ہاں تو یہاں سے ہم نے کالج ہال کے لئے ڈنر کو گئے۔ وہاں سے ڈاکٹر ٹلیارڈ کے "قہوہ" پہ جہاں ساڑھے دس بجے تک ادبی گفتگو رہی۔ یہ میرے استاد پروفیسر کولرکورج کے دوست ہیں اور مجھ پہ بہت مہربان ہیں۔ گیارہ بجے گھر پہنچے کچھ پڑھا اور سو رہے۔ آج اتوار کا دن تھا لہذا سینما وغیرہ سب بند تھے۔ اور میں کاسموپولیٹن کے علاوہ کہیں نہیں جاتا۔ اور وہ بھی اب کم ہے گا ہے۔ یہ دعوتیں محض اس مہینے میں زیادہ ہیں ورنہ۔ ع

بے صرفہ ہی گذرتی ہے گو عمرِ خضر ہو

کتاب کے مضامین پہ پنڈت جی سے نظرِ ثانی کروا لینی چاہیئے۔ طلبہ کے مضامین پہ۔ اور وہ جو میں نے لکھا تھا کہ اساتذہ کے مضامین کم کر دو اس سے نسبت کم کرنا مقصود تھا۔ یعنی طلبہ کے مضامین تعداد میں زیادہ

درکار ہیں۔ ورنہ مجھے اساتذہ سے عداوت تھوڑی ہے۔ بزم کی شان اور تفوق تو طلبہ ہی سے ہے۔

اس ہفتے چونکہ تمہارا خط بحری ڈاک میں آیا تھا اس لئے یہ خط بحری ڈاک میں جائے گا۔ تم میرا نیا پتہ۔ لندن کا ـــــ یاد رکھو اور بحری ڈاک میں اب ناغہ نہ ڈالنا۔ گذشتہ ناغوں کے متعلق معذرت کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ مسلسل خط بازی واقعی تضیع اوقات کا باعث بھی ہے، اور بار گراں بھی ہو جاتی ہے۔ وہ لطف جو ہوتا ہے جاتا رہتا ہے۔

فقط والسلام

مخلص تاثیر

کیمبرج
۱۹ر جون ۱۹۳۴ء

عزیزم السلام علیکم۔ تمہارا خط ملا۔ معمولی ڈاک سے۔ ہوائی ڈاک خالی گئی۔ خیر جب تک تم لکھتے رہو کوئی مضائقہ نہیں کہ تم کس ڈاک سے لکھتے ہو۔ میں ابھی تک کیمبرج ہی میں ہوں۔ لندن جانے کا ارادہ چند روز کے لئے ملتوی کر دیا ہے۔ کیونکہ ارادہ ہے کہ لندن جانے سے پہلے اس طرف کے مضافات کی مختصر سی سیر کر دوں۔

کالج کے نتائج کے متعلق اطلاع ملی ہے کہ حوصلہ شکن رہے ہیں۔ کیا تم مجھے پتہ لے کر بتلا سکتے ہو کہ انگریزی میں فیصدی کے حساب سے کیا نتیجہ رہا۔ میں جانتا ہوں تم جو کہو گے جواب میں —— یہی نا کہ کالج بند ہو گیا ہے۔ کلرک بڑے فرعون ہیں۔ گرمی سے جان ہوا ہو گئی ہے یا یہ کہ یہ معاملہ غیر اہم ہے —— اچھا بھئی تم آم کھاؤ یہ اطلاع بھی ہمیں کسی نہ کسی طور مل جائیگی۔ کل میری بہترین قمیض جس پر میرا

خرچ اسراف کی حد کو پہنچ گیا تھا آم ہی کی نذر ہو گئی۔ بڑی مشکل سے ایک آم ہاتھ آیا تھا۔ سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ کل کھانے کی نیت سے اُس پر ہاتھ بڑھایا تو قمیص غارت ہو گئی۔

سول اینڈ ملٹری گزٹ میں تمہارا مضمون دیکھا ہے۔ بھائی خدا کے لئے اپنی انگریزی کی اصلاح کرو۔ تمہاری گرامر کو کیا ہو گیا ہے، میں جانتا ہوں تم اس بات پہ تاؤ میں آ کر مجھے غلطیاں نکالنے کے لئے لکھو گے۔ مگر جھنجھلانے کی کوئی بات نہیں، اس میں واقعی غلطیاں ہیں طارق سے پوچھ لو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم انگریزی میں کودن ہو بلکہ تمہیں صرف یہ تبلانا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی چیز اشاعت کی غرض سے لکھی جائے تو نظرِ ثانی ضرور کر لیا کرو۔ پھر یہ تو خاصا طویل مضمون تھا۔ اور اتنے اہم موضوع پر۔

کیا حمید احمد خاں نے کتاب کے لئے اپنا مضمون لکھ دیا ہے اگر لکھ دیا ہے تو مجھے اطلاع ہونی چاہیئے تاکہ میں دیباچے میں کچھ کہہ سکوں۔ طارق کا مضمون بھی مشتبہ ہے۔ تم اتنے بخیلی کیوں ہو گئے ہو؟ —— تمہارے لئے راسپوٹن کے متعلق ایک دو کتابیں منگوائی ہیں تمہیں بھیجوں گا۔ ماناہری پر "کارواں" کے لئے تم نے جو مضمون لکھا تھا وہ بہت اچھا تھا۔ میں چاہتا ہوں راسپوٹن پر بھی تم کچھ لکھنے

سے پہلے یہ کتابیں پڑھ لو تاکہ تمہاری معلومات تشنہ نہ رہیں اور تم
اِس موضوع پر وثوق سے قلم اٹھا سکو۔
بھائی عطر کا انتظار اب تک ہے۔ دیکھیں کب پہنچتا ہے۔
فقط والسلام
مخلص تاثیر

کیمبرج
۲۶ جون ۱۹۳۴ء

عزیزم ۔ السلام علیکم ۔ تمہارا خط نہیں آیا ۔ یہ دوسری بار ہے کہ بحری ڈاک سے بھی تم ناغہ کر گئے ۔ عطر کی امید میں آٹھا چکا ہوں ۔ اس لئے اس کا تذکرہ نہیں کروں گا ۔ آج کی ڈاک سے لاہور سے جو خط آئے ہیں ان سے آذری کے نتیجے کا علم ہوا ۔ افسوس ہے محنت کرتا تو اچھے نمبر لے سکتے تھے خیر ابھی اور بہت سے امتحان باقی ہیں ۔

آج کانووکیشن تھی دعوتوں کا سلسلہ جاری ہے ۔ فوٹو بازی ہو رہی ہے اور کل تمام شہر سنسان ہو جائیگا ۔ یہ وقت اچھا کٹ گیا ہے ۔ الحمد للہ کہ نہایت خوش فہم اور صحیح الذوق لوگوں میں دن رات گذر رہی ہے اور ادبی مشاغل زوروں پر ہیں ۔ ہماری زندگی کے سنگ میل نئی کتابیں اور مناظرے ہیں ۔ آجکل ایلیٹ کی کتاب "چٹان" زیر بحث ہے اور ہم اس کے حسن و قبح پر نہایت تندہی اور گرمی سے بہم دست

وگریاں پہنتے ہیں۔ میں اور میرے ہمنوا اسے شاہکار سمجھتے ہیں۔ دوسرے
لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لایعنی تصنیف ہے۔ مجھے امید ہے تم سب نے
رشید نے طارق نے اور تم نے۔ یہ کتاب ضرور پڑھی ہوگی۔ اگر نہیں
پڑھی تو فوراً لیکر پڑھو۔ نہایت پُرلطف چیز ہے۔ انگریزی میں
مدتوں کے بعد ایسی جاندار تصنیف لکھی گئی ہے۔

میں غالباً ۳۰ جون تک لندن جاؤنگا۔ پتہ لکھ چکا ہوں۔ "بزم"
کے مضامین کی تفصیل لندن ہی کے پتے پر بھیجو۔

مخلص تاثیر

کیمبرج
۲۵ ر جولائی ۱۹۳۴ء

عزیزم السّلام علیکم۔ تمہارا خط بذریعہ ہوائی ڈاک ملا۔
تمہارے شکووں اور اضطراب سے مسرّت ہوئی۔ امید ہے اب تک تمہیں میرے لندن سے لکھے ہوئے پلندے مل چکے ہوں گے اور تمہیں تسلی ہوگئی ہوگی۔ میں اب بھی وہی ہوں جو پہلے تھا۔ بعدِ فضائی سے محض اتنا ہوا ہے کہ میں کم خود بین اور زیادہ باانصاف ہوگیا ہوں اور اپنی غلطیوں اور غلط بخشیوں کو ٹھنڈے دل سے دیکھ سکتا ہوں لہذا اپنے بدخواہوں کو معاف ہی نہیں کہ اس میں شانِ سرپرستی پائی جاتی ہے بلکہ ایک حد تک حق بجانب تصور کر سکتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ غلط فہمی کس طرح رائی کا پہاڑ بنا لیتی ہے۔ زاویۂ نظر کا ذرا سا اختلاف مادی اور جذباتی دنیا میں عجب عجب تمسیخ پیدا کر دیتا ہے خیر یہ وعظ ہوتا رہے گا۔ اس وقت مدعا یہ

ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ واپسی پہ نہایت متوازن ذہنیت سے زندگی کے چند دن علمی کاموں میں گزار دوں میرے پیشِ نظر چند ایک تجاویز ہیں۔ بروئے کار آگئیں تو سمجھونگا کہ جینا کام آگیا۔ اور یوں تو۔ ع

عاقبت منزلِ ما وادیِ خاموشاں است

بزم کا [۲۵] نیا قصہ غیر متوقع اور ناخوشگوار ہے۔ خیالات کے اختلاف سے یوں ورق ورق ہو جانا حد درجہ شرمناک ہے جب تم وہاں کچھ نہیں سمجھتے تو میں یہاں سے تمہاری شیرازہ بندی کیسے کر سکتا ہوں۔ مجھے بہت رنج ہوا ہے کہ تم اپنی آتش مزاجیوں سے اپنے ہی خسخانے کو راکھ کا ڈھیر بنا رہے ہو۔ اب فروغِ اردو کے دوسرے مجموعے کا چھپنا بھی معلوم! اگر تمہیں میرے رنج کا خیال ہے تو تمہیں چاہیئے کہ اس بزم پہ اپنے ذاتی اختلافات کو حاوی ہونے نہ دو۔ کم از کم میری واپسی تک اس کو ضرور زندہ رہنا چاہیئے۔ اور نہیں تو یوں مجھے بھی اس کے جنازے میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہو جائے گی۔

اگر تم پروف نہیں بھیج سکتے تو نہ سہی۔ میں ریویو کے لئے سرعبدالقادر سے تمہاری خاطر کہہ دونگا۔ تم خود بھی انہیں لکھ چکے ہو۔ مگر یہ بھی سچی بات

یہ ہے کہ مجھے ایسی غیر ذمہ دارانہ فرمائش سے جھجک آتی ہے۔
بغیر پڑھے ریویو؟ ——— لاحول ولا قوۃ! لیکن خیر میں یہ حجت بھی
تم پہ پوری کر دینا چاہتا ہوں تاکہ ریویو کی تاخیر تمہارے لئے بہانے
کے موجب نہ ہو جائے۔ گو اس کا نہ ہونا کوئی ایسا اہم حادثہ نہ ہوگا
کہ تم سوگوار ہو جاؤ لیکن تم چاہتے ہی ہو تو میں مجبور رہوں۔ میری مانو تو
میں مشورہ دونگا کہ کتاب کے چھپ جانے کے بعد اُن سے رائے
لی جائے تاکہ وہ دلجمعی کے ساتھ کچھ لکھ سکیں۔

ہاں میں لکھنا بھول گیا کہ "عمر خیام" اور یوسف علی کے تراجم
مل گئے تھے۔ ان کے لئے شکریہ۔ خدا کو کیوں ہمخواں بنانا عزیز
من تمہارا ہی کام ہے۔ صوفی تبسم کا ایک مضمون "مجلس" کے مجموعے
میں دیکھا۔ میں نے اس پہ تنقید لکھ کر بھیجی ہے۔ نیت اس سے یہ ہے
کہ شاید جل کر بہتر مضمون لکھ ڈالے۔ یا لکھنا بند کر دے یا مجھے ہی عتاب نامے
کی صورت میں یاد کر لے۔

وہ معارف پریس والا مجموعۂ اشعار "بہار" ——— نجانے
کیا نام تھا ——— ابھی تک نہیں ملا۔ اگلے زمانے کے شاگرد استاد
کے ارشاد کی تعمیل سو کام چھوڑ کر کرتے تھے۔ تم اچھے شاگرد ملے
کہ جس ہفتے کسی چیز کی فرمائش کروں ڈاک میں ناغہ کر جاتے ہو۔ اچھا

بابا ہیں ان فرمائشوں سے درگذرا تم خط و کتابت ہی کو نبھاؤ تو غنیمت ہے۔ نیرنگ خیال۔ ادبی دنیا اور ساقی وغیرہ کے سالنامے جب پڑھ لو تو مجھے بھجوا دینا۔ ادبی رفتار سے باخبر رہنا چاہتا ہوں۔

لندن [۲۶] سے میں نے تمہیں ہندوستانی مصوری کی نمائش کی تفصیل اور کتابچہ بھیجے تھے۔ الاماں۔ بہت ذلت ہوئی۔ محض سماجی مصروفیت کے طور پر روزناموں نے سرپرستی فرمائی۔ پنجاب میں فقط روپ کرشنا کا نام لیا گیا ـــــ فقط نام۔ بنگال اور بمبئی کا قدرے ذکر رہا۔ اور چند تصویریں لکھنؤ کی بھی بکیں۔ چغتائی کی تصویریں اعلےٰ درجے کی تھیں۔ ایک تصویر تو بہترین میں سے تھی۔ جو چرچا ان کا ہونا چاہیئے تھا اور جس توجہ کی یہ مستحق تھیں وہ نہیں ہو سکا۔ یہ کافی رنجدہ بات ہے۔ اور اس کا قلق عرصہ تک رہیگا۔

مخلص تاثیر

کیمبرج
۲۰ر اگست ۱۹۳۲ء

عزیزم السّلام علیکم۔ تمہاری شکایت بجا ہے۔ میں پچھلے دنوں یہاں سے بھاگا بھاگا پھرتا رہا۔ اس لئے تمہارے خطوں کا جواب نہ دے سکا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تم کو بھول گیا ہوں لندن سے میں نے تمہیں خط لکھ دیا تھا۔ اور میرا خط تمہیں برلن سے بھی مل گیا ہوگا۔

آج میں نے آتے ہی تمہارے خط دیکھے عزیزم کی کتاب کے پروف متوقع تھے لیکن تم نے نہیں بھیجے۔ ان کا کہیں بھی تذکرہ نہیں۔ بہرحال میں تمہیں ہدایتاً لکھنا چاہتا ہوں کہ کتاب کے مضامین کی ترتیب کا خاص خیال رکھنا چاہیئے۔ فروغِ اردو [۲۷] کے پہلے مجموعے کی اشاعت پر اربابِ علم و فن نے جس ہم آہنگ تحسین و ستائش سے خیر مقدم کیا اُس سے تم سب کی مسرت اگر

ناز کی حد کو پہنچ جاتی تو شاید میں اسے بہت بے جا نہ سمجھتا۔ پنجاب کے
ایک کالج کے ابتدائی مدارج کے چند طلبہ کی متفرق تحریروں کا ملک
کے طول و عرض میں ایسی استنادی حیثیت حاصل کر لینا کہ متبحر علما
اور مشاہیر ادبا جملہ جرائد و رسائل کے ہمنوا ہو کر اسے دنیائے ادب
کا موقر کارنامہ قرار دیں ہمارے ملک کی ادبی تاریخ میں ایک نادر
واقع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہ محض بزرگوں کی حوصلہ افزائی نہ تھی
محدود گروہوں کی داد طلب ثنا خوانی نہ تھی۔ پنجاب، یو پی اور دکن
ہر طرف سے ہر ایک نے یکدلی سے اسے معیاری تصنیف سمجھا اور
یوں صوبجاتی تعصبات کو برانگیختہ کرنے والوں کے شکایتی افسانوں
کو جھٹلا دیا۔ اور ثابت کر دیا کہ آج بھی ادب کے جوہری علدن و بخارا
بلخ و بدخشاں کے نام پر نہیں جاتے آب و رنگ کو پرکھتے ہیں اور
جہاں کہیں گوہر مقصود کو پاتے ہیں آنکھوں کی پلکوں سے اٹھاتے
ہیں اور سرمۂ نظر بناتے ہیں اردو کے پرستاروں کی اس بلند نظری
سے مجھے حقیقی مسرت ہوئی اور یہ فطری تقاضا تھا۔ بچوں کے پروان
چڑھنے پر کون خوش نہیں ہوتا۔ لیکن ان دل خوش کن اطلاعات کے
ساتھ ساتھ یہ خوف بھی پیدا ہوتا گیا کہ یہ قصیدہ خوانی ممدوحین کے
قوائے عمل کو معطل نہ کر دے اور یہ نونہال بزم زخم چشم کا شکار نہ

ہو جائے لیکن تم لوگ میری امیدوں سے بھی زیادہ پختہ و پائندہ نکلے۔ آج میں جب تمہارے نئے مجموعے کے لئے تعارف نامے کے مطالبات کو سنتا ہوں تو وطن سے دور وطن کے کارناموں پر خوش ہوتا ہوں۔

جو تفصیلات تم نے مجھے بھیجی ہیں ان سے ایک اور حوصلہ افزا نشان نظر آیا ہے۔ پہلے مجموعے میں عبدالواحد کا مقالہ اپنی قسم کا واحد مضمون تھا۔ یعنی شاگردوں کے مجمع میں محض ایک استاد کی جھلک نظر آتی تھی مگر اب طلبہ کے دوش بدوش اساتذہ بھی صف بستہ نظر آتے ہیں۔ نوجوانوں کی للکار نے بزرگوں کو بھی آمادۂ کار کر لیا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس مندر میں پروہت اور پجاری کی تمیز مفقود ہے۔ طلب علم کا فریضہ یکساں طور پر ہر پرستار کی زندگی کا مقصد اولی ہے — یہی وہ یگانگت کا رہے جو تمہاری بزم کا طرۂ امتیاز ہے۔ لیکن یہ یگانگت ہے یکسانیت نہیں یہاں سب ایک مقررہ لائحہ عمل کے مطابق قدم اٹھاتے ہیں منظم جماعت کے طور پر کام کرتے ہیں لیکن زنجیر بستہ قیدی نہیں انفرادیت اور آزادی بھی طور قائم ہے اور تنوع اختلاف رائے کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ جب مجھے ان بحثوں کا خیال آتا ہے جو

پرچوں کے پڑھے جانے کے بعد ہوا کرتی تھیں تو تعجب ہوتا ہے کہ
یہاں کیمبرج کی سی نامور دانش گاہ کی بہترین ادبی مجالس میں بھی اس سے
زیادہ پرجوش ہنگامے نہیں ہوتے۔

ہمارے ملک میں اور بھی بہت سی ادبی مجالس ہیں۔ لاہور ہی
میں ان کی تعداد شاید اوکسفورڈ اور کیمبرج کے برابر ہے اس سے
پہلے بھی تھیں اور بہت سی گذشتہ موسمِ بہار میں پیدا ہو چکی ہونگی۔
پرچے لکھنا پڑھنا اور شائع کرنا بھی اور کہیں نہیں تو چین میں کئی
ہزار برس پرانی رسم ہوگی اور کہا جائے تو کئی پراچین ودیادان اس کا
رواج قدیم ہندوستان کے کتبوں سے ثابت کرنے کے لئے مرنے
مارنے پر تیار ہو جائیں گے مگر قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداد ہے
کے علاوہ مجھے اس مجلس میں جو امتیازی خصوصیت نظر آئی وہ اسکی
حیات افروز فضا اور "جماعتی" تفہیمِ ادب کا ذوق ہے۔ یہ بزم نہیں
ایک تحریک ہے ایک زندہ رجحانِ خیال ہے اور ہمارے ملک کو
اسکی بہت ضرورت ہے آجکل بالخصوص بہت ضرورت ہے۔

خاص انداز کے مشاعروں کے انعقاد سے بھی میرا مقصد اسی
"جماعتی تفہیم" کی ترویج تھا۔ ہمارے بہت سے جدید نما نوجوان شاعر مشاعرے
کے نام سے بھڑک اٹھتے ہیں "مشاعرہ بازی" ادبی بازار کی جدید ترین

گالی ہے۔ مگر بازار میں ہر چیز بازاری ہوتی ہے۔ مشاعرے کا صحیح مقصد سمجھنے والے اسے مروجہ قباحتوں سے پاک کر کے اس کی ضرورت سمجھ سکتے ہیں۔ غالب و مومن۔ شیفتہ و آزاد۔ داغ و انور۔ ذوق و ظفر ایک مشاعرے میں زانو بزانو روبرو ہو کر طرحی غزلیں پڑھتے تھے اور وہ بھی عوام کے سامنے جبری تعلیم کے دور سے پہلے۔ اور ان میں سے ہر ایک ذوق ہو کہ غالب، داد کا طالب تھا۔ سخنور شعر عرض کرتا تھا اور سخن فہم پرکھتا تھا اور داد دیتا تھا۔ ہر بندش ہر صنعت ہر پہلو پر سب کی نظر رہتی تھی۔ اور یہ داد دستد برابر کا سودا تھا۔ تم نے پڑھا ہو گا کہ رقعات میں غالب سخن فہم کو سخنور پر ترجیح دیتا ہے۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب تنقیدی معیار واضح اور متعین تھا۔ زندگی اور ادب میں تفرقہ نہ تھا۔ نئی اور پرانی دُنیا دو مختلف دنیائیں نہ تھیں۔ رودکی سے داغ تک ایک ہی سلسلۂ روایات چلا آ رہا تھا۔ ترقی تھی تنوع تھا مگر زنجیر در زنجیر۔ باپ کے نحیف ہاتھوں سے اولاد مشعل لے کر آئندہ نسلوں کے سپرد کر دیتی تھی۔ مشاعرے اسی ادبی روایت کی یگانگت اور عالمگیر وسعت کے مظہر تھے۔ اور اسی مقصد کے احیا کے لئے آج کل مشاعروں کی ضرورت ہے۔ پہلے سے کہیں زیادہ اور آج کل ہی مشاعرے کم

ہو رہے ہیں۔

مگر تمہیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ مغرب سے اُمڈ آنے والے طوفان کو کفر و بدعت کہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ "بند" ٹوٹتے ہی ٹوٹے ٹوٹ چکا ہے۔ اور ان فتوؤں کی بدولت یہ طوفان اپنی اصلی طاقت سے کہیں زیادہ طاقت پکڑ چکا ہے۔ ہمیں اب نئی کیاریاں نئی نہریں کھودنی چاہئیں۔ اور پرانی راہوں کو وسیع تر کرنا چاہیئے۔ خوب جانچ تول کر مناسب پیمانے ڈھالنے چاہئیں۔ پھر یہ طوفان ہلاکت آفریں نہیں رہیگا بارانِ رحمت بن جائے گا۔ اور یہ زہر ہلاہل اکسیرِ حیات کا کام دیگا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ پرانے معیارِ ادب و دانش کو یکسر ناقص سمجھا جائے یا نئے سکول کو ٹکسال باہر تصور کیا جائے۔ بلکہ ہمیں تو لکھنؤ سکول کے اساسی اصول سے بھی اختلاف نہیں ہے کیونکہ ہم خود روایت پسند ہیں۔ مگر روایت پرست نہیں، روایت افترا ہیں۔ ادب کو محض ایک فرضی خلا میں معلق شخصیت کا انفرادی فعل نہیں بلکہ ایک زندہ جماعتی فضا کی پیداوار سمجھنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے جانچنے کے لئے ایک متوازن معیار کی ضرورت ہے۔ میں خوش ہوں کہ تم لوگ اسی اندازِ خیال کے ترجمان ہو اسی کے پرچار کیلئے پرچے لکھتے ہو پڑھتے ہو اور

شائع کرتے ہو۔

میرے خیال میں اس مجموعے کے بعد نظم اشاعت کے اس سلسلے کو کچھ عرصے کے لئے روک دو تاکہ یہ تحریکات ملک کی فضا میں اچھی طرح رچ جائیں۔ سموئی جائیں۔ اور پھر ہمراہیوں اور متبعین کو سانس لینے کی فرصت دے کہ ایک نئی جست لگاؤ۔ میرے سامنے ایک نیا پروگرام ہے، جس سے اردو ادب کی بنیادی استواری کی امید ہے۔ مگر میں ابھی اس راز کو افشا نہیں کرنا۔

ایک خط سعید اللہ کے نام ملفوف ہے۔ اس تک پہنچا دو۔ آجکل کالج بند ہے نہ جانے وہ کہاں ہوگا۔

مخلص تاثیر

کیمبرج

ہمبروک، کالج۔

عزیزم۔ السلام علیکم۔ پے در پے خطوط باعث راحت ہوئے۔ ماشاء اللہ طبیعت ہیں وہی طغیانیاں ہیں جو پہلے تھیں۔ وہی مدوجزر، وہی امید و بیم کی تندی۔ اب جنوری میں شادی ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔

میں تمہیں بھولا نہیں۔ محض مصروفیت تھی۔ اور پھر تعدادِ خطوط میں اب بھی کسی سے کسی طرح کم نہیں۔ اور پہلا وقفہ میری طرف سے نہیں ہوا۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھو کہ میں جواب الجواب کا قائل نہیں اور ...... مگر یہ تو تو ہیں میں بے پناہ ہو گی اور ظاہر ہے کہ جیت بہرحال تمہاری ہو گی لہٰذا۔ ع

بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است

بحمداللہ کہ بزم میں سکون ہو گیا۔ مگر "میں نے معافی مانگ لی"

کی جراحت نمائی مجھے پسند نہ آئی مجھے حمید احمد خاں اور سعید اللہ کے لمبے چوڑے خطوط بھی مل چکے ہیں - عزیز من! اپنے محسب بزرگوں سے ایسی دادوستد نازیبا ہے یہ معافی کیا اور اقدام صلح کیا - اور ہیٹی کیا اور غرور کیا - یہ الفاظ تو "لغات الاغیار" کے ہیں اپنوں ہیں یہ باتیں کیا معنی رکھتی ہیں - اور سچ پوچھو تو غیروں سے بھی آویزش نہ چاہیئے ہمیں دنیا میں اتنے کام ہیں کہ اغیار سے آویزش کے لئے فرصت نکالنا ان کے حضور میں بڑی بے ستائش باج گزاری ہے۔

رہا میرے آنے کا مسئلہ میں اسے راز رکھنا نہیں چاہتا مگر واقعات یہ ہیں مجھے ایم لٹ سے پی ایچ ڈی کی طرف کود کی اجازت بمشکل ملی تھی - اور پی - ایچ - ڈی کا کورس تین سال کا ہے اور میں کوشاں ہوں اور اس سلسلے میں میرا بڈھا بھی میرے ساتھ ہے کہ میں اسے دو سال ہی میں ختم کر سکوں شاید اس مہینے مجھے اجازت مل جائے۔ اور ۱۹۳۶ء کی ماہ جنوری میں فارغ ہو جاؤں مستقلاً نہیں تو عارضی طور پر ضرور اسی مہینے ہندوستان آسکونگا ——— آجاؤنگا۔

بزم کے مضامین کی اشاعت کا شدت سے انتظار ہے مگر میں اب تعارف نامہ نہ لکھ سکونگا - معذور ہوں مجھ پر اعتماد کرو - ہاں

سعید اللہ کو میں نے لکھا تھا کہ نیرنگِ خیال کے سالنامے میں میرا ایک مکالمہ [۲۸] "غالب کے گھر پہ ایک شام" شائع ہوا ہے۔ پڑھ کر بتانا کیسا ہے۔ تم اگر چاہو تو بزم کے کسی جلسے میں اسے "سٹیج" کر ڈالو ــــ لیکن اسی صورت میں کہ اگر تم اسے اس قابل سمجھو تو۔ ہدایات سعید اللہ کے خط میں مندرج ہیں۔ زنانہ لباس زنانہ آواز یا زنانہ لباس کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ اسے تم محض "ڈرامیٹک ریڈنگ" کہو۔

پرسوں برسٹل سے ایک خاتون کا بھیجا ہوا بڑا سا پارسل [۲۹] لندن سے ہوتا ہوا یہاں آیا۔ میں تو اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تمہارے بھیجے ہوئے ریکارڈ ہیں۔ بیچاری کو تم نے خواہ مخواہ پریشان کیا۔ خدا جانے وہ اس تحفے کو کن مصیبتوں سے بحفاظت تمام لاہور سے برسٹل تک لائی ہوگی۔ خیر اس کا اور تمہارا شکریہ۔ لیکن مزید تکلیف غیر ضروری ہے۔ مجھے ریکارڈ کچھ ایسے پسند نہیں۔ تمہارے خط زیادہ دلچسپ ہیں انہیں پر توجہ دو ــــ لیکن کیا ممکن ہے کہ تم ایک بڑا پیکیٹ تمباکو خوردنی کا فوراً بھیجدو۔ گو اس سلسلے میں میرا پہلا تجربہ غیر خوشگوار ہے لیکن ایک مرتبہ اور آزما دیکھنے میں کیا حرج ہے۔

"اردو مجلس" کے متعلق تمہاری رائے اگر اچھی ہے تو "مجلس" کے مضامین بھی تم کو پسند آنے چاہئیں۔ تمہاری طرف سے اگر زہر خوردنی ہوئی تو مجھے سخت دُکھ ہوگا۔ زہر خورانی غیر ضروری ہے اور غیر مفید بھی۔ آخر وہ لوگ بھی تو اُردو کی خدمت کر رہے ہیں تمہیں باہمی محبت اور تعاون سے کام کرنا چاہیئے۔ ایک مخلوط جلسہ کیوں نہیں کرتے۔ تم تو خود اس امر کی تحریک میرے پاس کیا کرتے تھے۔ آغا حمید سے تمہاری برسوں سے آشنائی ہے لیکن اگر تمہیں اس سے خود کہتے ہوئے شرم آتی ہے تو مجھے لکھو کہ میں سلسلہ جنبانی شروع کر دوں۔

جرمنی کیوں جاتا ہوں؟ کیوں نہ جاؤں؟ اس سے بہتر جگہ اور کونسی ہے —— دل اینجا مدعا اینجا —— کا مضمون ہے۔ گو یہ جگہ اپنے سیاسی انتشار کی وجہ سے انسانوں کے رہنے کی نہیں لیکن زندگی کو رنگین بنانے کا سامان اب بھی وہاں ہے —— نہیں بھئی تمہارا قیاس غلط ہے۔ جو خاتون حضرت علّامہ سے ملی تھیں مجھے ان کی تلاش برلن نہیں لے جاتی۔ تمہیں یہ کس نے کہہ دیا کہ وہ گویا برلن کی رہنے والی ہیں۔

میرا وزن بہت سرعت سے کم ہو رہا تھا گیارہ سٹون دو

پاؤنڈ تک اُٹھ گیا تھا لیکن خیر اب تدارک کر لیا ہے۔ اس وقت گیارہ سٹون سات پاؤنڈ ہوں۔ اور یہ ٹھیک ہے۔ فوٹو اگلے ہفتے اتروا رہا ہوں۔ مانگ بہت زیادہ ہے — جی ہاں مگر خیر ایک کاپی تمہیں بھی بھیج رہا ہوں۔

گاگا کی کامیابی پر مبارک۔ اسلام اور کفر کی بک بک تو فضول ہے۔ مگر تمہاری یہ تازہ عقیدت مندی بڑی اہم ہے۔ مجھے وہ تمام تشکوک افزائی یاد ہے، جو تم کیا کرتے تھے اور میں تردید کیا کرتا تھا۔ اب تم اسے بھول جانے کے لئے مجھے خواہ مخواہ اپنا حریف تصور کرنے لگے ہو۔ خدا رحم کرے لو اب آخر میں ایک دو شعر سن لو:—

آہ و فریاد نہ کر شکوۂ بیداد نہ کر
وہ تجھے بھول گئے تو بھی انہیں یاد نہ کر
تیرے گلشن میں نئے نغمہ سرا ہیں صیاد
میری اب کون سنے گا مجھے آزاد نہ کر
عشق خوددار نہیں حسن وفادار نہیں
ذکرِ شیریں نہ سنا ماتمِ فرہاد نہ کر

غزل مکمل نہیں ہوئی۔ آج کل میں ہو جائے تو نقل بھیجوں گا

اتنی اچھی نہیں لیکن تمہیں بھیجنے میں کوئی حرج نہیں۔

فقط والسلام

مخلص تاثیر

کیمبرج
۲۱ نومبر ۱۹۳۴ء

عزیزم۔ السلام علیکم۔ تمہارا خط نہیں ملا۔ خیر باشد؟
تم نے پچھلے خط میں اپنی طبیعت کی ناسازی کی اطلاع دی تھی خدا کرے تم باخیریت ہو۔ آج میرا ارادہ خط لکھنے کا نہیں تھا لیکن پھر تمہاری علالت کا خیال آگیا۔ سو یہ چند سطریں جلدی میں گھسیٹ رہا ہوں۔ اس وقت دن کے دو بجے ہیں اور میں آگ کے سامنے ڈریسنگ گاؤن پہنے بیٹھا ہوں ایک دو آشنا دس دس بیس بیس منٹ بیٹھ کر چلے گئے ہیں۔ میں "بے لباسی" پر معذرت کئے جاتا ہوں لیکن کسی سے اٹھتا نہیں۔ جی چاہتا ہے تم یہاں ہوتے ——— اچھا مرضیٔ مولا از ہمہ اولےٰ۔ لیکن کمبخت تو نے اپنی شادی بھی تو نہیں کرائی اب تک۔ اور یہ بھی نہیں بتایا کہ ارادے کیا ہیں کوئی امتحان دے رہا ہے یا نہیں ——— ہر خط میں دنیا بھر کے

لوگوں کے قصّے کہانیاں ہوتی ہیں لیکن اپنے متعلق کچھ نہیں۔

صوفی سے ملو تو ایک اطلاع لے دو۔ خدا جانے کتنی دفعہ لکھ چکا ہوں مگر وہ اپنے دھندوں میں کچھ اس بری طرح مصروف ہے کہ اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا۔ اسے کہو کہ وہ امرتسر سے مجھے فیری خرید و فروخت کے متعلق تفاصیل حاصل کر کے بھیجے۔ تم اسے بار بار کہو۔ شاید کام کر دے۔

کرسمس چلا آرہا ہے۔ چہل پہل ہونے والی ہے۔ مگر میں دسمبر میں یہیں رہونگا۔ آگے جرمنی گردی میں بہت وقت تلف ہوا ہے۔ ہاں دو تین دن ایک دوست کے ہاں گذارنا چاہتا ہوں تاکہ فرنگیوں کے راہ و رسم سے واقفیت ہو جائے۔ یہاں ایک "اردو بزم" قائم ہوئی ہے آج پہلا جلسہ ہے۔ غیر رسمی چیز ہے۔ سر عبدالقادر کے صاحبزادے منظور قادر کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ سر عبدالقادر بھی چند روز ہوئے یہاں آئے تھے۔ "ہندوستان کے لئے متحدہ زبان کی ضرورت" پر ایک لیکچر دیا تھا۔ میں خود تو اسے سن نہیں سکا۔ مگر لوگ بہت تعریف کرتے ہیں لندن میں بھی سنتا ہوں، سر عبدالقادر کی مساعی سے ایک بزم اردو عنقریب جاری ہونے والی ہے۔ میرا ان میں سے کسی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس بزم میں ایک پرچہ "ہندی نوجوانوں کی مشکلات" پر پڑھ چکا ہوں۔ اقبال اور رومی پر ایک پرچہ

پیپیز سوسائٹی میں پڑھا ہے۔ لارڈ لوتیاں کی طرف سے ایک چٹھی میں مجھ سے "جدید ہندی مصوّری کے رجحانات" پر پرچہ پڑھنے کے لئے پوچھا گیا ہے۔ وہی بات ہوئی۔ ع

یک من و بر سر قتل اندپہ ی نذاشے چند

ارادہ ہے کہ ۲۰ر دسمبر کے بعد ہر قسم کی مصروفیات ختم کر دوں۔ تھیسس کے سر ہو جاؤں اور جلد از جلد ختم کر کے تمہارے پاس آجاؤں

والسلام

مخلص تاثیر

کیمبرج
۵ر دسمبر ۱۹۳۴ء

عزیزم۔ السّلام علیکم۔ تمہارا خط آج صبح ملا۔ ڈاک کل رات دیر سے پہنچی تھی۔ اس لئے مجھے اس کی اطلاع نہیں ملی۔ صبح اخبار دیکھنے لگا تو تمہارا خط ملا۔ کتاب کے متعلق آخری اطلاعات ملیں۔ کتاب کے پروف غور سے پڑھنا۔ بلکہ اس معاملے میں بدر سے استمداد کرو۔ انڈکس کا خیال بہت اچھا ہے۔ ضرور ہونا چاہیئے۔ اُردو کی جدید کتابوں پر تنقید کرنے کا خیال اس سے بھی اچھا ہے، یہ ایک نئی بات ہوگی۔ مجھے کل ہی مرزا یاس یگانہ کی طرف سے آیاتِ وجدانی اور غالب شکن کی ایک ایک کاپی ملی ہے۔ بہت اچھا ہو اگر تم میں سے کوئی مطبوعاتِ جدیدہ میں ان پر تنقید کر سکے۔ یہ کتابیں ضرور غور کے قابل ہیں۔

لیکن تنقید کرتے وقت یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ

میرزا یگانہ کو یہ شکایت ہے کہ اہلِ زمانہ نے اس کی ناقدری ہی نہیں کی بلکہ اس کا دل بھی دکھایا ہے۔ ادھر اہلِ زمانہ کو یگانہ سے شکایت ہے کہ اس نے اہلِ زمانہ کا دل دکھایا ہے اور انہیں طرح طرح سے ستایا ہے۔ یہ شکایتیں ایک حد تک پُر لطف ہوتیں اگر واقعات اہمیت نہ اختیار کر لیتے۔ واقعات یہ ہیں کہ چند مقامی اور ہنگامی اختلافات کی بنا پر نہ صرف یگانہ ایسے صاحبِ کمال کو وطن چھوڑ کر بال بچوں کو خدا کے حوالے کر کے فکرِ معاش میں دلیس بدلیس پھرنا پڑا بلکہ مرزا یگانہ کے ادبی کام کو غیر متعلقہ باتوں کی خاطر نظر انداز کر دیا گیا۔ ادبی اعتبار سے یہ آخر الذکر بے رخی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ تم نے بھی کئی اچھے بھلے پڑھے لکھے لوگوں کو یاس کے مجموعۂ کلام کے متعلق یہ کہتے سنا ہو گا کہ اسے کیا پڑھیں یہ شخص تو غالب کو شاعر نہیں مانتا۔ یہ رائے روز بروز پھیل رہی ہے جانتے ہو کیوں۔؟

غالب کو شاعر نہ ماننے سے زیادہ یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ یاس اچھا نقاد نہیں۔ اور یہ نتیجہ یاس کی شاعری سے غیر متعلق ہے۔ اچھے شاعر عموماً اچھے نقاد نہیں ہوتے۔ یہ اجتماع بہت شاذ ہے۔ یاس نقاد نہ سہی لیکن اس کی شاعری سے بے اعتنائی کیوں

کی جائے۔

بفرضِ محال اگر غالب کو شاعر نہ ماننے سے شعر فہمی ہی نہیں بلکہ شعر گوئی کی بھی نفی ہو جاتی ہے تو بھی یاس گردن زدنی نہیں۔ کیونکہ وہ غالب کو شاعر ہی نہیں بلکہ اچھا شاعر بہت اچھا شاعر سمجھتا ہے۔ اسے کد ہے تو اتنی کہ غالب کے علاوہ اور بھی اردو کے شاعر ہیں۔ اور یہ کہ اندھا دھند غالب پرستی سے اُردو ادب کے صحیح نشو و نما کو اور ذوقِ تنقید کو نقصان پہنچتا ہے۔ نیز یہ کہ غالب شاعر ہے صوفی اور ولی نہیں اور اس کا کلام ادبی نقائص سے معرّا نہیں۔ یاس ان بدیہی باتوں کو وجدانی مبالغہ اور تندہی سے دہراتا ہے اور اس کا یہ طریق ایک ردّ عمل ہے جو بجنوری کے غلوّ کا قدرتی نتیجہ تھا ——— گو یاس کی مخاصمت کی ابتدا لکھنؤ کی معیار پارٹی سے اختلاف سے ہوئی ——— آخر یہ کہاں کی تنقید ہے کہ "ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ہیں۔ وید مقدس اور دیوانِ غالب" یہی نہیں بلکہ بجنوری نے تو مفکرینِ عالم کے پراگندہ اقوال کے غلط سلط تراجم لے کر غالب کے اشعار پر چسپاں کر کے عجب عجب نتائج مرتّب کئے ہیں۔

یہ بھی نہ سہی بجنوری سراپا راست اور یاس ہمہ تن تقصیر سہی۔

اس سے بھی یاس کی شاعری کسی طرح ناقابلِ توجہ نہیں ٹھہر سکتی - یاسؔ عروض کا ماہر ہے اس اعتبار سے بھی اس کے کلام کا مطالعہ ضروری ہے۔ کئی جگہ وہ محض مہارت کے اظہار یا مخالفین کو پھانسنے کی نیت سے ایک ایسا زحاف استعمال کر جاتا ہے جو شاید نفسِ مضمون کے اعتبار سے غیر ضروری ہو لیکن اس میں وہ بے قصور ہے۔ کیونکہ متقدمین عموماً مضمون اور ترتیبِ اصوات کے تطابق سے بے توجہ رہے ہیں اور ہمارے ماہرینِ بلاغت بھی اس کی مثالیں زحافات ہی میں نہیں بلکہ اور موضوعات سے بھی مل سکتی ہیں لیکن یہ ایک الگ مضمون ہے اور اس پہ اُس وقت غور کیا جا سکتا ہے جب ہماری بزم کی کسی مجلس میں کوئی نوجوان نقاد "آیاتِ وجدانی" پہ ایک سیر حاصل مضمون پڑھنا چاہے۔

یاس کے کلام کا ایک اور پہلو بہت اہم ہے اس میں ایک ہم آہنگ طرزِ خیال پایا جاتا ہے جو ایک مکمل شخصیت کا آئینہ بردار ہے۔ کبھی کبھی یہ یگانگت تکرار کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور ایک ہی مضمون ایک ہی قسم کے الفاظ میں دو دو تین تین بار نظر آتا ہے مثلاً دیر و حرم - یا مجسم و موہوم کا تقابل۔

یاس کی شاعری محض حسیات و جذبات کی ترجمانی پر اکتفا نہیں

کرتی . اس میں تنقید حیات کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ قدرت زبان کی وجہ سے یاس گہرے خیالات صاف یا محاورہ عبارت میں بیان کرتا ہے اور اس کا کلام محاورہ برائے محاورہ اور بے معنی رعایت لفظی سے عموماً پاک ہے۔

لکھنؤ کے مقامی ہنگاموں کی یادیں جو یاس کی نثر کو تلخ بنا دیتی ہیں غزل میں بھی کہیں کہیں موجود ہیں لیکن اصل واقعات کو اتنا عرصہ گذر چکا ہے کہ اب یہ چوٹیں کچھ ایسی سنگین معلوم نہیں ہوتیں مثلاً اس مقطع میں ـــ

یاس اب ذلیل ہی کو سمجھتے ہیں سب عزیز
کانٹے چمن کے تلتے ہیں پھولوں کے ہار میں

عزیز کا ایہام ایک شوخی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اور یہ مقطع ـــ

لکھنؤ کے فیض سے ہیں دو دو پھیرے میرے سر
اک تو استاد یگانہ دوسرے داماد ہوں

اس واقعہ کے باوجود کہ اسکی شادی لکھنؤ میں ہوئی ہے کچھ ایسا خوشگوار معلوم نہیں ہوتا۔ مگر یہ مقطع ـــ

مزار یاس پہ کرتے ہیں شکر کے سجدے   دعائے خیر تو کیا اہل لکھنؤ کرتے

واقعات کے علاوہ بھی اثر انداز ہے۔ کلام یاسؔ پر مفصل لکھنے کے لئے یہ چند اجمالی اشارات ہیں! امید ہے خیال افروز ہوں گے میں پھر کہونگا کہ یاسؔ کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے غیر متعلقہ امور کو فراموش کر دینا چاہیئے۔ مجھے یاد ہے "آیاتِ وجدانی" کی اشاعتِ اوّل پر میں نے یاسؔ سے کہا تھا کہ آپنے دیباچے اور بین السطور حواشی سے کسی تنقید کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ حالانکہ مجھے اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیئے تھا کہ ناقدری کا شاکی ہنرور اگر خود شناسی کی حد سے گذر کر خود ستائی تک جا پہنچے تو یہ انکساری کی طرح محض غلو ہے اور اس کو قبیح سمجھتے ہوئے بھی صحیح تنقید کا حق ادا کرنا ضروری ہے۔ لیکن مجھے ڈر تھا کہ میری صحیح رائے میں غیر متعلقہ امور سے خلل نہ آگیا ہو۔ مثلاً غالب شکن میں رباعیات بیگانہ کا اشتہار ہے یوں کہ" یہ عمر خیام کی رباعیات سے کم نہیں" ایک فوٹو ہے جو" آیاتِ وجدانی" میں بھی ہے اس کے نیچے نہ جانے کیوں انگریزی کا ایک فقرہ لکھا ہوا ہے انتساب چنگیز خاں کے قہرِ عذاب کے نام ہے۔ دونوں کتابوں کے ناموں ہی پر غور کرلو۔ یہ سب ناقدری کے احساس کے نفسیاتی مظاہر ہیں۔ نقاد کو یہ سب باتیں قصداً نظر انداز کر دینی چاہئیں اسے فارسی شاعری کے مستقل موضوع در مدح خود میگوئید اور عربی کی فخریہ

شاعری کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔

غرض یاس کے کلام پہ لکھتے وقت ہنگامی، مقامی اور ذاتی باتوں سے بالا ہو کر لکھو۔ یاس کے اشعار یقیناً اس قابل ہیں کہ ان کی خاطر اس قدر تزکیۂ نفس کیا جائے۔ فقط والسلام

مخلص تاثیر

کیمبرج

۱۲ر دسمبر ۱۹۳۴ء

عزیزم السلام علیکم۔ "احسان" اور "مجلس" مل گئے۔
احسان مجھے بہت پسند آیا۔ نہایت عمدہ روشن ہے۔ نکات بھی
خوب ہیں۔ حسرت [۳۰] کی طبیعت زوروں پر معلوم ہوتی ہے
اللہ کرے ......

آج کیمبرج سنسان ہے۔ ٹرم ختم ہو چکی ہے۔ اتوار کا دن یوں
بھی ماتمی ہوتا ہے۔ ایک دو احباب جو رخصت ہونے بھی آئے۔ آج
میں اردو کے بعض رسائل کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک خیال آیا۔
رسائل میں کتب کی نسبت بہتر ادبی مواد جمع ہو رہا ہے آئندہ
یہ رجحان اور بھی بڑھ جائے گا کیونکہ بوجہ روز افزوں غربت کے
کتابوں کا چھاپنا مشکل ہوتا جائے گا۔ لیکن جو ادب ان رسائل میں
چھپ رہا ہے اُس کے محفوظ ہوتے کی کوئی ضمانت نہیں۔ ابھی وقت

ہے کہ اردو کی روزافزوں مطبوعات کا ذخیرہ کیا جائے ورنہ کچھ دیر کے بعد یہ پھیلاؤ سمیٹنا ناممکن ہو جائے گا اور ادب کے جواہر پارے ایسے منتشر ہو جائیں گے کہ ان کی تلاش ناممکن ہو گی۔ اس لحاظ سے ابھی سے اس آنے والی مصیبت کا استیصال کیا جا سکتا ہے ورنہ آنے والی نسلیں ہمارا نام لعنت سے یاد کریں گی۔ اگر یوں ہو سکتا کہ ہندوستان کی چند بڑی بڑی لائبریریاں کاپی رائٹ لائبریریاں قرار دی جا سکتیں جہاں قانوناً اردو کی تمام تصنیفات اسی طرح مفت بھیجی جاتیں جس طرح پریس برانچ والوں کو مفت بھیجی جاتی ہیں تو اردو ادب ایک جگہ محفوظ ہو جاتا اور اس کے ضائع ہونے کے امکان مٹ جاتے۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے یہاں انگلستان میں کیمبرج اوکسفورڈ لنڈن ایڈنبرا اور ڈبلن کی پانچ لائبریریاں اسی نوعیت کی ہیں اور یہاں تمام انگریزی مطبوعات قانوناً بھیجی جاتی ہیں مگر اس اہم تجویز کو عملی صورت دینے کے لئے وقت چاہیئے۔ میں یہاں سے اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ ہاں اگر تمہیں میرے خیال سے اتفاق ہے تو پھر تم اگر کچھ چاہو تو ہاتھ پاؤں مار سکتے ہو۔ بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ اردو ادب کے تحفظ کی یہ بہترین تجویز ہے اور اس پر ضرور غور ہونا چاہیئے۔

مدراس کے جسٹس اخبار نے سینما پر مضمون مانگا ہے۔ خط سے وضاحت نہیں ہو سکی کہ کس فلم پر مضمون درکار ہے۔ اگر ہندوستانی فلموں پر مطلوب ہے تو بھلا میں یہاں بیٹھا وہاں کے متعلق کیا لکھوں۔ اگر مغربی فلم پر رائے درکار ہے تو وہ اس لحاظ سے قبل از وقت ہوگی کہ ہندوستان میں فلم کافی دیر کے بعد نمائش کے لئے پیش کئے جاتے ہیں لیکن خیر یہ تو باتیں ہوتی رہیں گی مگر ۱۶ تاریخ سے لندن میں بیسل رائٹ کی ایک فلم کی نمائش ہو رہی ہے۔ نام ہے "لنکا کا گیت" اس کی بہت تعریف سنی ہے۔ چند دوستوں کے ساتھ اسے دیکھنے جا رہا ہوں۔ دیکھ کر رائے کا اظہار کروں گا۔ یہ فلم ڈاکیومنٹری ہے۔ روسی انداز کے تتبع میں۔ یعنی کسی ایکٹر کا کام نہیں کرتے بلکہ لنکا کے اصل باشندوں ہی کی مدد سے فلم مرتب ہوا ہے۔ بھئی ڈاکیومنٹری فلم کا بہترین نمونہ تو ایسنٹائن کا مجروح کارنامہ "تھنڈر اور میکسیکو" ہے جس کا پہلا حصہ سنکلیر نے مسخ کر کے نکالا تھا اب دوسرا نکل رہا ہے۔ میرے پاس اس کے بعض عجیب و غریب ساکت فوٹو اور تمام کا تمام اصلی سینیریو موجود ہے۔ نہایت شاعرانہ چیز ہے اردو میں کوئی پرچہ اس کا اہل ہوتا تو تمہیں ترجمے کے لئے بھیجتا۔ حفیظ نے تو "اسلامی کارنامہ" نکالا ہے، بھلا وہاں حسن و جمال کی گنجائش کہاں اور پھر جہاں تصویریں ہوں ہاں

فرشتے نہیں بھٹک سکتے۔ اُدھر تمہارا جنوری میں بیاہ ہو رہا ہے تمہیں خود۔۔ فرصت نہ ہوگی ـــــ جنوری میں ہو بھی رہا ہے یا نہیں۔ اب تو ٹھیک ٹھیک بتا دو۔ انگلستان آنے کے وعدے تو اب فراموش ہو چکے۔ اب کیا ہے اب سچ بول ڈالو۔ یونہی تنوع کی خاطر ہی کبھی تو کوئی نئی بات کیا کرو۔ والسلام

مخلص تاثیر

کیمبرج
۱۷ر دسمبر ۱۹۳۴ء

عزیزم - السّلام علیکم - قبل ازیں چند ایک فرمائشیں کر چکا ہوں - اب مجھے معارف کا ستمبر کا پرچہ مطلوب ہے - مگر فوراً - ہوائی ڈاک سے بھجوا دو - میں بھی تمہیں "سینما کوارٹرلی" کی تازہ ترین اشاعت بھیج رہا ہوں ساتھ ہی ایک آدھ کتاب بھی - (رشوت کے طور پر نہیں) معارف کا پرچہ ضروری ہے اگر تم ہمت کرو تو کوئی وجہ نہیں مجھے جنوری کے آغاز میں کیوں نہ مل جائے - تمہاری کاہلی کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی -

ہاں "مجلس" کے متعلق تم نے رائے پوچھی ہے - تمہاری رائے پہلے سُن چکا ہوں - مطبوعہ مضامین سب کے سب میرے دیکھے ہوئے ہیں اور بیشتر سُنے ہوئے بھی - اس لئے کوئی چیز نئی نہیں - سرورق تبسّم کے ہاں الوداعی دعوت پر دیکھا تھا - لکھائی چھپائی ویسی نہیں

کہ ان دیکھی ہو۔ نئی بات کیا ہے جو تم مجھ سے پوچھتے ہو۔ تمہیں یہ بات نہ بھولنی چاہیئے کہ "اردو مجلس" اور "فروغ اردو" دونوں بہنیں ہیں اور ان کی مطبوعات پر ہم سب کو مسرت ہونی چاہیئے چنانچہ مجھے اس امر سے خوشی ہوئی ہے کہ تم کو اس اشاعت کی قدر ہے اور تم نے اس کی نقل بطور تحفہ مجھے بھیجی ہے۔ سالک کی تقریب نہایت مزیدار ہے اور بخاری کی تمہید کافی پر لطف۔ کہیں کہیں تو خوب خوب فقرے لکھے ہیں۔ پریم چند پر مضمون بہترین ہے۔ ایک افسانہ ہے جو پہلے بھی چھپ چکا ہے ـــ کارواں میں ـــ "گوئٹے کا پیغام" ناکمل نظر آتا ہے۔ نیٹشے اور "اقبال" پر مضامین علمی ہیں تنقیدی نہیں۔ اختر۔ جوش۔ اور فانی پر تین مضامین اردو شاعری سے متعلق ہیں۔ ادبی اعتبار سے اختر پر راشد کا مضمون اچھا لکھا ہوا ہے، "پریم چند" اور "اختر" پر مضمون تمہارے اچھے مضامین کے ہم پایہ ہیں۔ نٹشا۔ گوئٹے اور اقبال علمی مقالات ہیں اور حمید کا "پہرہ دار" تخلیقی چیز ہے۔ اور حیرت! تبسم کا "سیاحت نامہ" میری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ ایک ایسی ابن بطوطیت ہے جس سے میں ناواقف ہوں۔ جوش اور فانی پر جو مضامین ہیں وہ تمہارے عام مضامین سے ڈگمگاتے ہیں۔ مجموعی طور پر مجموعہ کامیاب ہے۔ اور لکھائی چھپائی کے

لحاظ سے تمہاری کتاب سے زیادہ جاذبِ نظر ہے۔

کیمبرج سنسان پڑا ہے۔ اکثر طلبہ لندن جیسے مرکزی شہروں میں سیر و سیاحت کی غرض سے چلے گئے ہیں۔ میرے ذمہ کام نہ ہوتا تو میں بھی جاتا۔ مگر جب کام کے انبار کو دیکھتا ہوں تو عافیت اسی میں نظر آتی ہے کہ کیمبرج ہی میں پڑا رہوں۔ میں نے کل شام ہیفر والوں کی معرفت سینما پر تمہیں تین کتابیں بھجوائی ہیں۔ ہسپانوی افسانوں کا ایک نیا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا تھا۔ بالکل نئی چیز ہے وہ بھی تمہیں بھجوایا ہے تمہاری فرمائش کا حال بھی معلوم ہوا۔ شاباش! میں تو تم سے قرآن کے تراجم اور ادبی کتابیں مانگتا ہوں تم مجھ سے فرینک ہیرس کی خفیہ زندگی پر ممنوعہ کتاب طلب کر رہے ہو۔ بالکل ہی دیدہ، یٹم ہو گئے ؟— بہر حال میں تمہیں فرینک ہیرس کے افسانوں کے دو مجموعے بھجوا رہا ہوں۔ انہیں پڑھو اور اپنی طبیعت کو اعتدال پہ لانے کی کوشش کرو۔ تمہیں اچھی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ مجھے یاد ہے [۲۱] کالج میں تم بالزک کے "سو بانی افسانے" حاصل کرنے کے لئے کس طرح لائبریری کے چکر کاٹا کرتے تھے۔ اور اب جو میں غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ مولیساں سے تمہیں جو ظاہری اُنس تھا اُس میں "حبِ علی" کو کوئی دخل نہیں تھا۔ بلکہ اُس کی

بیباک تحریروں میں بھی شاید تم اپنے جذبات کی تسکین کا سامان ڈھونڈا کرتے تھے۔

یہاں جاڑے کا زور ہے، برف باری ابھی شروع نہیں ہوئی۔ البتہ اولے پڑتے ہیں۔

مخلص تاثیر

کیمبرج

پیمبروک کالج

۴ر جنوری ۳۵ء

عزیزم السلام علیکم۔ تمہارا خط نہیں ملا۔ تمہاری اِس غیر متوقع خاموشی پر تعجب ہے۔

پچھلی ڈاک میں میں تمہیں تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ تم اپنے ارادوں سے مجھے مطلع کرو۔ مجھے تم سے ایک "بزنس مین" کی قسم کے خط کی ضرورت ہے۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے اپنے متعلق کیا ارادے باندھ رکھے ہیں۔ تم دنیا جہان کی باتیں کرتے ہو لیکن اپنے متعلق دانستہ خاموشی اختیار کر جاتے ہو ——— شاید اس نیّت سے کہ میں پریشان نہ ہوں اور اس موضوع پر گھڑی گھڑی تم کو لکھوں ——— آذری کے خط سے معلوم ہوا کہ تم نے ابھی تک اپنی کتابوں کو ایک نظر دیکھا تک نہیں۔ حالانکہ اپریل میں تمہارا امتحان ہے۔

تمہارے پاس بہت اچھا بہانہ ہے کہ تم بزم کی کتاب کی اشاعت میں مصروف رہے لیکن میں اس بہانے کو وقعت نہیں دے سکتا۔ تمہیں اپنے امتحان سے بے خبر نہیں رہنا چاہیئے۔ کتاب تو مرتب ہو ہی چکی ہے۔ پروف اس کے بدر دیکھ سکتا ہے۔ تم کو اب زیادہ اہم کام کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ آذری کے ساتھ مل کر مطالعے کا وقت مقرر کرو۔ گو میں جانتا ہوں کہ تم دونوں اکٹھے ہوئے تو گالی گلوچ کے سوا کچھ نہ ہوگا لیکن اس سے تمہارے لئے مدد لئے بغیر چارہ نہیں۔ تو لو اب اپنے امتحان کے متعلق مجھے ٹھیک ٹھیک لکھو کہ کیا ارادے ہیں دل ناپاک کے۔ امتحان دے بھی رہے ہو یا اس سلسلے میں سلطان مقصود کی پیروی کرنا چاہتے ہو ــــــ مجھے تمہارے آئندہ خط سے یہ تمام باتیں تفصیل سے معلوم ہونی چاہئیں۔ اس مرتبہ گپ بازی کو کم کر دو۔ شاعرانہ تفصیلات کی بجائے حقائق کی طرف توجہ دو۔ ؏

ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد

کتاب چھپ جائے تو مجھے بھجوا دینا۔ خدا تمہیں زندگی اور صحت عطا کرے مافوق البشر کام کیا ہے تم نے۔ ایک مہینے میں تن تنہا بڑے سائز کے تین سو صفحات کی کتاب چھاپ مارنا کارنامہ ہے بھائی

ہم تو محض کارفرمائی کیا کرتے تھے۔ اب کے وہ بھی نہیں تھی۔ پہلے بھی تم تھے اب بھی تم ہو۔ خدا کرے میرے آنے تک تم وہیں کہیں شاد و خرم آباد ہو۔ فقط والسلام

مخلص تاثیر

بویتھین سوسائٹی

کیمبرج

۹ر فروری ۱۹۳۵ء

عزیزم السّلام علیکم۔ رسید اً لکھ رہا ہوں کہ تمباکو، "بال جبریل"، "معارف"، "بہار"، مل گئے۔ شکریہ۔ اب فروغِ اُردو کے نئے مجموعے کا انتظار ہے۔

ہاں مجھے معلوم ہے ابوالاثر حج کو چلا گیا۔

ادبی دنیا والوں نے سالنامہ بھیجا تھا۔ پنڈت جی کی غزل پڑھی۔ اِسی زمین میں مکمل غزل سعیداللہ کو بھیج چکا ہوں۔ ملاحظہ ہوئی کیا۔؟

ایک ضروری کام ہے ——— فرمائش ——— تم کہو گے حسبِ عادت!

میں الگ لفافے میں بحری ڈاک کے ذریعے پوسٹل آرڈر بھیج

دوں گا ـــــ گھبراؤ نہیں ـــــ لیکن خواہ ادھار لو یا جس طرح ـ دو نسخے "بالِ جبریل" کے آج ہی روانہ کردو ـ میر عبدالقادر کو ضرورت ہے، دیکھنا تاخیر نہ کرنا میں ان سے کہہ چکا ہوں کہ تم مستعدی سے کام کرو گے ـ یہاں اردو کتابیں ملتی نہیں اور ہندوستان کے بیشتر کتب فروش ایسے ہیں کہ پیشگی رقم بھیجتے ڈر لگتا ہے ـ ہاں تو دو عدد "بالِ جبریل" فوراً بھجوادو ـ

اور ہر طرح خیریت ہے ـ یہ ملک کچھ پسند سا آگیا ہے ـ نہایت دلفریب لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں ـ عجیب عجیب مظاہرات ہوتے ہیں شخصیت کے جملہ امکانات کے اظہار و تربیت کے مواقع موجود ہیں ـ جبھی شاید یہاں سے ہلنا نہیں ـ کسی پہ عاشق نہیں کہ یہ کم نظری کی نشانی ہے ـ لیکن بے عشق بھی نہیں رہتا ـ ؏

جاوداں پیہم دواں ـ ہر دم جواں ہے زندگی

یہاں "تن کی دولت" ہی نہیں "من کی دولت" بھی میسر آسکتی ہے اور ـ ؏

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں

یہ غزل پڑھی تم نے اقبال کی ـ ؏

مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگے مرغِ چمن

اردو میں ایک انوکھا طرزِ تحریر ہے۔ پیارا۔ سادہ۔ عمیق۔ عجیب عجیب ٹکڑے ہیں صنعت گری کا کمال ہے۔ ع

ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟

آخری ٹکڑا "تو شہر اچھے کہ ......" والا زیادہ متعجب اور پُر زور اسی لئے ہو جاتا ہے کہ مصرع اوّل مصرع دوم سے ساخت میں پیوستہ ہے۔ ؎

حسنِ بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟

ساری غزل معجزاتی ہے۔ آخری شعر نفسیاتی اعتبار سے ڈرامائی ہے جس سے تمام غزل چمک اُٹھی ہے۔ اِس میں ایک ایسے خیال کی تردید ہے جو ماقبل لفظوں میں ظاہر نہیں ہوتا۔ مگر لازماً موجود ہے۔ اور اسی تردید سے اس کا بیان بھی ہو جاتا ہے اور رد بھی۔

"اقبال" "من کی دنیا" کو بے نیازانہ اور برترانہ ماحول کہے جا رہا ہے جس سے لازماً خیال پیدا ہوتا ہے کہ پھر غلام بھی آزاد ہوا۔ من کی دنیا کا مالک ہو سکتا ہے ——— مگر جب قلندر یہ کہتا ہے کہ۔ ع

تو جھکا جب غیر کے آگے تو من تیرا نہ تن

تو ندامت سے پانی پانی کر دیتا ہے۔ غزل کے پہلے اشعار میں پس منظر

کس قدر پیارا ہے ——— اور پھر "درا" پہ بیاں قطار اندر قطار" پر غور کرو لفظاً اور معناً اقبال کے کلام میں ایک نیا رنگ نظر آتا ہے۔ یہ غزل بار بار پڑھنے کی چیز ہے اسے بار بار پڑھو۔

"بال جبریل" کے متعلق تاکید ہے۔ بابا ہل بھجوا دینا۔ مگر تاخیر نہ کرنا۔

بہت دلپسند موسم ہے۔ کم بخت تم یونہی وہاں جم گئے۔

مخلص تاثیر

۴ سینٹ پیٹرس ٹیرس

کیمبرج

۲۶ر فروری ۳۵ء

عزیزم السلام علیکم۔ فرحت نامہ مورخہ ۱۲ر
فروری سیدھا مکان پر ملا۔ کل ۲۵ر کو۔ ہوائی ڈاک میں کچھ جواباً
لکھ چکا ہوں اب تفصیلاً لکھتا ہوں۔ تمہاری تصویر ملی۔ بہر طور اصل
سے بدتر ہے۔ بہزاد بھی ہوتا تو بہتر ناممکن تھی۔ اور میری تصویر اصل
سے بہتر تھی۔ بدتر ناممکن۔ خیر یہ تو ہُوا جواب۔ مزاح کے طور پر۔
مگر واقعہ یہ ہے کہ ساختہ تصویر اتروانے کی فرصت ہے نہ رغبت۔
اور جو موجود تھیں ان میں یہی بہتر تھی۔ آج کل میں ایک "الوداعی تحفے"
کے طور پر اتروانی ہے۔ چند نقول بھیجدونگا۔ ہر کسی کو جو اس کی
اہلیت رکھتا ہو۔ اور اہلیت محض خواہش کا نام۔ دوستوں۔ عزیزوں
میں۔ میں نے ہمیشہ یہی سمجھا ہے۔ اپنی خواہش کو اپنی اہلیت اور

دوسروں کی خواہش کو دوسروں کی اہلیت۔ بھی خواہشات کے معاملے میں کسی دوست سے نہیں الجھا۔ برخوردار مجھے واقعی افسوس ہے، کہ میں بہت کچھ بدل کر واپس آرہا ہوں۔ میں چاہتا تھا کہ جوں کا توں ــــــ خرِ عیسیٰ؟ اچھا یوں ہی سہی ــــــ لوٹ آتا۔ مگر بقول شعرائے جدید مجھ پہ رنگینیوں کے محشرستان ٹوٹ پڑے ہیں اس ہولی میں سے بے رنگ نکلنا مجھ جیسے سراسر زندہ انسان کا کام نہ تھا۔

تم کہتے ہو غزل اچھی نہیں لکھی۔ فلاں شعر یوں ہی سا ہے۔ تم یہاں نہ جانے کیا کرتے رہے۔ ماحول کو ڈھالتے تو جان جاتے۔ لیکن اب عارضی "شائستگی" کے آثار نظر آتے ہیں۔ ایک نظم لکھی ہے ایک خاص کیفیت کے گزرنے پر۔ شاید پسند آئے ــــــ گو میں نے یہاں سے جتنے شعر کہے ہیں تم کو پسند نہیں آئے ــــــ مجھ سے گیت اور داسوخت کی توقع نہ رکھو۔ ہاں ڈرتا ہوں کہیں وطن میں آکر داسوخت کی ضرورت محسوس نہ ہو۔

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

کی یہ تفسیر بہتر ہے۔ ہے نا؟ کمبخت نہ خود آیا نہ شادی کرائی۔ کیا تو کیا؟ امتحان کی طیاری۔ وہ بھی ادھوری۔

کتاب کے ساتھ پنڈت کی رائے کی اشاعت بے جوڑ نہیں۔ تمہاری دلیل صحیح ہے مگر پرانی آراء کی اشاعت بوضاحت ہونی چاہیئے ورنہ بد دیانتی ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب تو جبر علاج کے لئے بھوپال گئے ہیں مگر سید سلیمان ندوی کو مطبوعہ کتاب بھیجدو۔ اور رائے بطریق سابقہ الگ چھاپو۔ دس بارہ دن لگیں گے۔ اگر ضروری ہے تو ــــ لیکن پرانی آراء کو دہرانا چہ معنی دارد؟ سالکؔ سے رائے لی؟ کتاب لے کر اُن کے پاس آج ہی پہنچو۔ یہ تم نے اپنے بزرگوں سے روٹھنا کیوں اختیار کیا ہے۔ برخوردار تم کس دنیا میں بستے ہو۔ باہمیں مرد ماں بباید ساخت۔ تم نے اچھے اچھوں کو کیا کرتے نہیں دیکھا جو اپنوں کو ہاتھ سے دے رہے ہو۔ میں آؤنگا ــــ کب؟ ۱۹۳۶ء میں کبھی ــــ تو پھر خندۂ دنداں نماں کا سلسلہ جاری ہو جائیگا۔ مگر اب ہمیں کام کرنا ہے دنیا بہت کچھ دیکھ لی ہے ارمان تھے ہی کم۔ جو تھے نکل چکے ہیں۔ اب تو جم کر کچھ کرنے کی نیت ہے۔ اسی لئے شادی کی صلاح بھی ہے۔ اس میں نسل، رنگ اور ملک کی تمیز نہیں۔ یہاں ہو یا وہاں ہو۔ وہی ۔ ع

ہر ملک ملکِ ما ....

اپنے حلقے کے انتشار پر قنوطی نہ ہو۔ لوگ پھسل گئے ہیں تو

کیا ہُوا۔ رہے نام اللہ کا۔ حفیظ جالندھری حج کر آئے۔ میں بھی لوٹ آؤں۔ پھر سب احباب اِس مرکز کو دیکھ کر خود بخود سمٹ آئیں گے۔ اسمبلی۔ خالدہ ادیب خانم۔ موسم۔ حضرت علامہ کا سفر اور ریویو ممبری۔ بھائی یہ سب خبریں مجھے اخبارات سے اور دیگر خطوط سے پہنچ جاتی ہیں اس لئے تم اپنے خطوں کو ان پہ ضائع نہ کرو۔ قیمتی باتیں وہ ہیں جو تم "خانگی" امور کے متعلق لکھتے ہو۔ بزم کے ہنگاموں سے "جُوتی" [۳۲] مشاعرے کے انعقاد تک مو خرالذکر کی روئداد تفصیل سے بھجوایا کرو۔

عید کا لطیفہ بہت پُر لُطف تھا۔ تمہارے سوا کسی کو ایسی نہیں سوجھ سکتی۔ مگر بھائی افسوس تو یہ ہے کہ میں عید کے موقع پر لندن میں نہیں تھا۔ کہیں اور عید منا رہا تھا ——— اب بقر عید قریب ہے مگر لندن جانے کا ارادہ نہیں ——— مجھے کیا ملیگا نماز میں۔

بحمداللہ تم منکرانِ ازلی کو میرا غالب والا مکالمہ پسند آیا۔ اشعار کے حوالے ظریفانہ فضا کے لئے تھے۔ کچھ "ثابت" کرنا مقصد نہیں تھا۔ مگر تم کہہ رہے ہو کہ اُسے محض" بولا یا ہ جائیگا۔ میں حیران ہوں کہ یہ محض بولے جانے سے کس طرح پر لُطف ہو سکتا ہے تاآنکہ

سُننے والے کو غالب پر پورا عبور نہ ہو۔ یا وہ اسے اچھی طرح پڑھ نہ چکا ہو۔ لیکن اسلامیہ کالج کے طلبہ غالب تو پڑھتے ہی ہیں آخر۔ ہاں نیرنگِ خیال میں ایک آدھ کتابت کی بھی غلطی ہے۔ مثلاً شروع ہی میں "کچھ اُس بد ذوق کا انداز ہے" کی جگہ "اندازہ" چھپا ہے۔ صفحہ ۲۱ پر سطر آٹھ 'لیتیں' کی جگہ 'لیں'۔ ایک جگہ "مذاق میں ٹال دیتے ہو" میں "میں" مفقود ہے۔ اور ایک جگہ "دیئے" کو "دے" چھاپ دیا ہے۔ لیکن نیرنگِ خیال کیا خود تمہاری مطبوعہ کتاب کا بھی یہی حال ہے۔ پہلے حصّے کا اتنا اہتمام تھا پھر بھی غلطیاں تھیں۔ اب تم کہتے ہو پروف فقط تم نے دیکھے ہیں۔

تم کالج کی سیاسیات [۳۳] کی طرف مجھے متوجہ کر رہے ہو۔ میں اس سے نفور ہوں۔ میرا دھیان تو اب کسی اور ہی طرف ہے تم لوگوں سے پھر سے ملنے کی حسرت نہ ہوتی تو شاید میں جنوب مشرق کا رُخ پھر نہ کرتا۔ مگر

مجھ کو مجھ سے چھین لیا ہے میرے اپنے پیارے دل نے
ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے پریم بھری تلواروں نے

لیکن یہ بند ایک نظم کا ہے جس کا محلِ استعمال مختلف ہے سُن لو۔

مجھ کو تنہا رہنے دو تم اپنے حال پہ رہنے دو
خوش رہتا ہوں؟ اچھا ہوں میں۔ دکھ سہتا ہوں؟ سہنے دو
مجھ کو تنہا رہنے دو تم اپنے حال پہ رہنے دو

مرے دل کی آگ بجھا دی آہیں بھرنے والوں نے
میری ٹھنڈک کھو ڈالی ہے الفت کرنے والوں نے
مجھ کو تنہا رہنے دو.....

مجھ کو مجھ سے چھین لیا ہے میرے اپنے پیاروں نے
ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے پریم بھری تلواروں نے
مجھ کو تنہا رہنے دو.....

ڈھانپ لیا ہے میرا تن من نازک نازک پردوں میں
چھوڑو مجھ کو دم گھٹتا ہے میرا تم ہمدردوں میں
مجھ کو تنہا رہنے دو.....

قید کیا ہے تم نے مجھ کو الفت کے بت خانے میں
محو ہوا جاتا ہوں اب میں آپ اپنے افسانے میں
مجھ کو تنہا رہنے دو.....

چار طرف سے گھیر لیا ہے میں تم میں کھویا جاتا ہوں
اب میں اپنی آنکھوں سے بھی اوجھل ہوتا جاتا ہوں

مجھ کو تنہا رہنے دو.....

میری اک تصویر خیالی تم نے آپ بنالی ہے
مجھ سے تم کو پیار نہیں ہے میری مورت پیاری ہے
مجھ کو تنہا رہنے دو.....

یہ احباب کو سنا سکتے ہو۔ مقصود اسے بزم میں گا سکتا ہے مگر چھپنے کی چیز نہیں ہے۔ اس لئے بھی کہ یہ بہت ذاتی ہے۔ بہت تازہ ہے۔ یہ چھپی اور میری لذت گئی ـــــ یہ تکلف نہیں بوضاحت لکھ رہا ہوں کہ کسی کو چھپنے کے لئے نہ دینا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کلام موزوں بھی ہے یا نہیں۔ پنڈت جی کو کہنا تقطیع کر کے دیکھ لیں یہ فعلن فعلن شہ ہے۔ ۱۵ ماترے کا مصرع ہے بظاہر شاید کہیں کم و بیش ہو۔ میں نے اسے نظم کی نیت سے نہیں کہا تھا۔ ہو گئی ہے۔

اور کیا لکھوں؟ ـــــ موسم؟ خوشگوار تھا۔ آج بوندا باندی رہی۔ اب کے سردی پڑی نہیں۔ اس صدی میں اتنی کم سردی کبھی پڑی ہی نہیں ـــــ بحیثیت مجموعی ـــــ لیکن ایک ہفتہ تو خوب رہا۔ برف" چھاجوں برست فود" تھی۔ نذیر اور میں اور چند احباب نشانہ بازی کرتے رہے۔ اور ـــــ مگر اب تو سردی

جاتی دکھائی دیتی ہے۔ سُنا ہے لاہور میں "کمر توڑ" بخار کا زور ہے تم ذرا احتیاط کرنا۔ موسمی آدمی ہو تم صحت کے معاملے میں۔ اور پھر شادی کے خواب بھی دیکھ رہے ہو میری طرح۔

تبسم نے ناؤ کھا کہ جواب نہ دیا۔ میں یونہی اپنی طرف جواب کی تیاری کرتا رہا۔ ارادہ تھا تینوں خط چھپ جاتے۔ میرا حملہ تبسم کا جواب اور پھر میرا جواب الجواب۔

آذری۔ طارق۔ بشیر کو پیار۔

پروفیسر بھائیوں کو سلام و نیاز

طارق کے نام خط ملفوف ہے، مذاق کیا ہے میں نے کہیں "سنجیدگی" نہ سمجھ لے۔ والسلام

مخلص تاثیر

۴ سینٹ پیٹرس ٹیرس

کیمبرج

۲۹ جون ۱۹۳۵ء

عزیزم۔ السلام علیکم۔ تمہارا افسردہ دل خط ملا۔ یہ بیب

طوفان اس لئے ہے کہ کیوں محنت کئے بغیر تمہیں ایم اے میں اوّل

نہیں کیا گیا۔ اس تجربے سے فائدہ اٹھاؤ۔ قدرے انکسار سیکھو۔

اور اگلی دفعہ امتیازی حیثیت حاصل کرو۔ اچھا ہوا کہ تھرڈ کلاس

کے آخر میں نہیں آئے اور دائمی ذلت کی مہر نہیں لگ گئی ——

تم خوش ہونے کی بجائے اُلٹا محرّمی بن گئے ہو۔ سنبھلو بھائی ——

سنبھلو —— مقصود اور تم —— تم ضرور۔ اسلامیہ کالج میں لوٹ

آؤ۔ ایم۔ اے کا طالب علم بیرونی اور آزاد ہوتا ہے اور اگلے سال

تم اپنے زور بازو سے پاس ہو گے " سہارے " کے محتاج کیوں ہونے

لگے۔ تمہارا اسلامیہ کالج میں لوٹ آنا مفید ہے۔ سنو اور مقصود سے

بھی کہو۔ ؎

کہن شاخے کہ زیرِ سایۂ او پرورآوردی
چو بوگش ریخت اندیشے آشیاں بردا شتن ننگ است

تم کو چاہیئے کہ نامساعد حالات میں بھی ماحول کو ڈھالنے کا ڈھب سیکھو۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ باقی رہا یہ کہ جانے تم کن وہموں میں پھنسے ہوئے ہو۔ آخر میں آرہا ہوں۔ اگلے سال کی ابتدا میں۔ اب جنتری نکال کر "ہارسکوپ" کس طرح بنادوں۔ تم کافی متخیل ہو۔ کوئی افسانہ بنالو۔ میں نے تم سے کچھ عرصہ گذرا بابو "سوکی بمکہ سیچین بادران انڈیا" اور "جیل مینول" کی ایک نقل مانگی تھی۔ تم نے آسمان سر پہ اُٹھالیا۔ سارے ہندوستان کو جاخبر کی کہ تاثیر "جیل مینول" مانگ رہا ہے۔ خدا معلوم میں جو بات تمہیں لکھتا ہوں وہ افسانہ کس طرح بن جاتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تمہارا ہاضمہ کب درست ہوگا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم اگر میری باتوں کی اشاعت کو اتنا ہی ضروری سمجھو تو کم از کم "مزاح نویسی" کے انداز کا صریح جھوٹ ساتھ شامل کرنا بند کردو ——— یا شاید تم چاہتے ہو کہ یہ خط و کتابت بند کردی جائے۔ ممکن ہے کہ دن کے بیٹھے خط لکھتے لکھتے خراب ہو جاتے ہیں۔ اور پھر میری آئے دن کی فرمائشیں یا تم کہو بھی تو گیا ——— اب یہ "جیل مینول" مجھے انشاء اللہ تمہاری "مساعیٔ حسنہ" کی طفیل جیل پہنچا

کے رہے گی۔ طارق نے بھی لکھا ہے کہ مطلوبہ کتابیں بے راہ" ہیں ——

خوب!

ممکن ہے میں نے بھی اپنے خطوں میں کبھی زیب داستان سے کام لیا ہو۔ حالات کو بڑھا چڑھا کر لکھا ہو۔ مگر اس کا تعلق محض تم سے تھا۔ دنیا بھر سے نہیں۔ میں تمہارے خطوں کو دوستوں کی محفل میں موضوعِ گفتگو نہیں بناتا۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم سب عموماً اشخاص پر بحث کرنے کے بڑے عادی ہیں۔ کام کی بات کم کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارے کاموں میں ذاتیاتی عناصر خلل انداز ہونے لگتے ہیں۔

خیر یہ وعظ ہوتا رہیگا۔ اب سنو کہ تم معمولی باتوں کو خاطر میں نہ لاؤ۔ ایم اے میں فیل ہو جانا کوئی اتنی آفت نہیں کہ تم کنوئیں میں چھلانگ لگا دو۔ میں سمجھتا ہوں تمہارا یہ نتیجہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اب کوشش کرو۔ غیر علمی کام یکسر ترک کر دو۔ اپنی کتابوں سے غرض رکھو۔ تم اگر چھ مہینے بھی یکسوئی اور اطمینانِ خاطر سے اپنی کتابوں پر صرف کر سکو تو فرسٹ نہ سہی فرسٹ کلاس میں ضرور آسکتے ہو۔ یقین نہ آئے تو میرے الفاظ کی حقیقت آزمانے کے لئے یہ چھ مہینے لگا دیکھو۔ یہ بحیثیت طالب علم تمہارا فرض ہے اور تمہارے کام کیلئے اور تمہارے احباب کے لئے مفید بھی۔ زیادہ نہیں تو تم میرے آنے تک ہوش اور مصلحت کوشی

سے کام لو۔ انشاءاللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

طارق کے نتیجے کا بہت افسوس ہوا مجھے اُس پر بہت امید تھی۔ اس سے تو یہی بہتر تھا کہ وہ بھی تمہاری طرح فیل ہو جاتا۔ اس کا خط آیا ہے۔ جواب دینے کو جی نہیں چاہتا۔ اُمنگ نہیں۔ نہیں جانتا کہ کیا لکھوں۔ اسے جھوٹی تسلیاں کیا دوں۔ خدا اس کا حامی و ناصر ہو۔ اتنی دور سے مشورہ بھی دوں تو غلط ہوگا ——— مگر اس کو ہوا کیا۔ یہ تو ایسا نہ تھا۔

اکو پھر فیل ہو گیا؟ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اب کے خط ذرا مفصل اور گپ باز لکھو۔ مقصود کہاں ہے؟

تمہارا خیر اندیش
تاثیر

[۱] انگلستان کی طرف روانہ ہونے سے قبل تاثیر نے مجلۂ کارواں کے دوسرے سالنامے کی ترتیب اپنے ذمّے لی تھی۔ رسالہ کسی حد تک ترتیب دیا جا چکا تھا کہ بعض وجوہ کی بنا پر تاثیر اس سے الگ ہو گئے اور خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی نے اس کی ترتیب اشاعت کے فرائض تاثیر اور دوسرے احباب سے مشورہ کرنے کے بعد مجید ملک کے حوالے کر دیئے۔ پرچے کی اشاعت پر اخبارات میں جب ریویو شائع ہوئے تو نیرنگ خیال نے اپنے تبصرے میں اس پرچے کی ترتیب اور خود مرتب کے بارے میں بعض ایسی باتیں لکھیں جن پر شبہ گزرتا تھا کہ وہ خود تاثیر کی لکھی ہوئی ہیں۔ تاثیر اس زمانے میں کیمبرج پہنچ چکے تھے لیکن صحافتی دنیا سے تعلق رکھنے والوں کا خیال تھا کہ تاثیر نے جانے سے قبل یہ تبصرہ لکھ کر حکیم یوسف حسن کو دے دیا تھا کہ جیسے ہی پرچہ شائع ہو اسے چھاپ دیا جائے۔ اس تبصرے کا سب سے دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اس کا طرزِ تحریر تاثیر کے اسلوبِ نگارش سے ملتا تھا اور بعض ایسی باتوں کا اس میں ذکر تھا جو تاثیر کے علاوہ کوئی نہ جانتا تھا۔ مثلاً "کارواں" میں عزیز، حشمت اور ناطق کے نام سے جو غزلیں شائع ہوئی تھیں وہ دراصل ان کی نہ تھیں مگر یہ تمام چیزیں خود تاثیر نے کارواں کی ادارت سے الگ ہونے سے قبل خود مسودات کی صورت میں مجید ملک کے حوالے کی تھیں۔ بعد میں جب اس فروگذاشت پر "نیرنگِ خیال" میں لے دے ہوئی جو تاثیر کے ایک دوست حکیم یوسف حسن کا رسالہ تھا تو لوگوں کو بجا طور پر

شبہ گذرا کہ اس تبصرے میں تاثیر کا ہاتھ تھا اور انہوں نے غالباً دانستہ یہ غزلیں شائع کروانے کے لئے مجید ملک کے حوالے کی تھیں۔ شبے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ "نیرنگِ خیال" والے تبصرے میں انہیں مضامین پہ اصل بحث تھی جو تاثیر کے زمانۂ ادارت میں کارواں کیلئے موصول ہوئے تھے اور جنہیں تاثیر نے "کارواں" سے الگ ہونے سے قبل دیکھ رکھا تھا اس سارے معاملے نے ایک خوفناک صورت اختیار کر لی۔ اخبارات و رسائل میں تاثیر کے خلاف بعض نہایت افسوسناک مضامین شائع ہوئے۔ تاثیر کے دوستوں کا خیال تھا کہ ایسی صورت میں تاثیر ان حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے خود موجود نہیں ہیں اپنی طرف سے جواب دینا چاہیئے چنانچہ بعض مضامین تاثیر کی حمایت میں ان کے دوستوں کی طرف سے بھی شائع ہوئے۔ اور ان مضامین کا انداز غالباً حملہ کرنے والوں کے مضامین کے انداز سے ملتا جلتا تھا۔

[۲] کیمبرج میں انگریزی ادب کے مشہور استاد سر آرتھر کولر کوچ ڈاکٹر تاثیر کے ٹیوٹر مقرر ہوئے تھے۔ سر آرتھر ایک تجربہ کار استاد تھے جن کے سامنے کئی ایسے شاگرد زانوئے ادب طے کر چکے تھے جنہوں نے بعد میں نام پایا۔ لیکن تاثیر نے کیمبرج میں چند مہینوں کے قیام کے بعد سر آرتھر کو کچھ ایسا گرویدہ کیا کہ وہ ان کے کمالات کا اعتراف مجلسوں میں بھی کرنے لگے۔ جب تاثیر تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وطن کی طرف لوٹنے لگے تو سر آرتھر نے انہیں ایک تعارفی خط مرحوم سر اکبر حیدری صدرِ اعظم حیدر آباد دکن کے نام دیا تھا جو پروفیسر حمید احمد خاں نے اسلامیہ کالج لاہور کے مجلہ "کریسنٹ" کے تاثیر نمبر میں شائع کیا ہے۔ اس خط کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کیمبرج کے اس بوڑھے استاد کی نظروں میں تاثیر کی کس قدر وقعت تھی۔

[۳] پروفیسر عبد البشیر آذری ایم۔اے تاثیر کے ان چند عزیز شاگردوں میں سے تھے جن کی بہبود و فلاح ہمیشہ تاثیر کے پیش نظر رہی۔ پروفیسر آذری کو چونکہ مذہبی کتابوں کے مطالعے کا بہت ذوق تھا اس لئے وہ اپنے زمانۂ تعلیم میں بھی داڑھی رکھتے تھے یہ بات ان کے بعض ساتھیوں کو ناپسند تھی خصوصاً اس وجہ سے کہ جب بھی وہ کسی مقابلے کے امتحان میں بیٹھتے تو اپنی تمام تر قابلیت اور ذاتی جوہر کے باوجود وہ انٹرویو میں اپنی ہیئت کذائی کی وجہ سے ناکام ہو جاتے۔ ان کے ساتھیوں کو یہ بات بہت ناگوار گذرتی۔ چنانچہ وہ انہیں چڑانے کی غرض سے ان کی ڈاڑھی پر جو محض چند بالوں کی صورت میں ان کی ٹھوڑی پر نظر آتی طرح طرح کی پھبتیاں کستے۔ ان کی شکل وصورت پر فقرے کرتے، خیال تھا کہ وہ ان پھبتیوں سے تنگ آکر ڈاڑھی کا صفایا کر دیں گے۔ لیکن آذری اپنی ضد پر اڑے رہے حتیٰ کہ ان کے بعض ساتھیوں کو ایک دن یہ خدمت ایک بڑی خوفناک سکیم کے ماتحت خود سرانجام دینا پڑی۔ آذری اس "دردناک" واقعہ کے بعد کئی دن کالج سے غیر حاضر رہے۔ تاثیر کو جب اس حادثۂ عظیم کا علم ہوا تو وہ "مجرموں" سے بہت خفا ہوئے۔ خیر کچھ عرصے کے بعد آذری پھر داڑھی بڑھا کر کالج میں آ گئے۔ تاثیر نے دیکھا تو کہا "اب ٹھیک ہے، ورنہ بزِ اخفش کا فقرہ کس پر کسا جاتا"۔

[۴] بزمِ فروغِ اردو کے نام سے ایک ادبی مجلس ۱۹۳۱ء میں تاثیر نے اسلامیہ کالج کے بعض ادب پسند طلبہ اور ادیب اساتذہ کی مدد سے جاری کی۔ اسکی سرگرمیوں میں طلبہ اور اساتذہ دونوں برابر کے شریک ہوتے۔ پرچہ پڑھا جاتا۔ اس پر تنقید ہوتی۔ پرچہ پڑھنے والے کی شخصیت اور مرتبے کو کچھ عرصے کے لئے نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ استاد اور شاگرد آمنے سامنے یا ایک ہی صف میں بیٹھ کر مضمون کو تولتے۔ انداز بیان کو

پر کھتے۔ استدلال پر غور کرتے بحثا بحثی میں شام کا دھندلکا رات کی تاریکی میں بدل جاتا مگر بحث ختم نہ ہوتی اور مضمونِ زیرِ غور کے متعلق نئی نئی تنقیحات پیدا ہوتی چلی جاتیں۔ ادبی مجالس کے لئے یہ انداز کار ایک نئی چیز تھی چنانچہ کئی برس بعد جب بزمِ فروغِ اردو کی مجالس کا رنگ بدل گیا اور وہ محض ایک عام قسم کی ادبی محفل بن کر رہ گئی تو لاہور کی دوسری مجالس نے بھی اس کا مخصوص انداز اختیار کر لیا۔ یہ انداز آج بھی لاہور کی بعض مشہور ادبی جماعتوں کی کارروائیوں میں نظر آتا ہے۔ اس بزم کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گورنمنٹ کالج لاہور کی اردو مجلس کے ساتھ اس کا صحت مندانہ مقابلہ تھا۔ اردو مجلس کی کامیابی کے لئے پروفیسر اے۔ ایس بخاری کی ذات ضامن تھی اور وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ بزمِ فروغِ اردو کے شائع شدہ پروگرام سے ان کے پروگرام کا تصادم نہ ہو۔ اس طریق سے دونوں مجالس بڑے تعاون اور باہمی میل جول سے کام کرتی رہیں۔ اور دونوں جماعتوں کے ارکان ایک دوسرے کی مجالس میں شرکت کرتے رہے۔ تاثیر کے نزدیک اس بزم کی بنیاد محض اردو کے فروغ کے لئے ہی نہیں تھی بلکہ اپنے طلبہ میں انگریزی ادبیات کی صحیح تفہیم کے لئے رکھی گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہمارے نوجوان انگریزی اندازِ تنقید کو اچھی طرح سمجھ کر اسی معیار سے اپنی ادبیات کو پرکھیں۔ خصوصاً اس لئے کہ ہمارا ادب جدید مغربی اثرات اور نئے حالات میں پرورش پا رہا ہے اور نئے اصولِ نقد اور نئے اندازِ تنقید کا مستحق ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ مجلس مغرب زدہ لوگوں کی نہ تھی بلکہ ایسے افراد کی جماعت تھی جو کورانہ تقلید پرستی کے ضرور دشمن تھے لیکن اپنی پرانی فصاحت و بلاغت کی کتابوں اور اپنی قدیم ادبی روایات کو بیکار نہیں سمجھتے تھے

یہی وجہ تھی کہ جب مارچ ۱۹۳۳ء میں سر عبدالقادر مرحوم کی صدارت میں قدیم رنگ کے ایک فرشی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا تو شعرا اور مہمان سب مشرقی لباس میں تھے۔ فرش ایرانی اور ترکی غالیچوں کا تھا، شعرا گاؤ تکیوں سے لگے بیٹھے تھے۔ حاضرین میں پیچوان اور نقرئی گلوریوں کا دور چل رہا تھا۔ شمعیں روشن تھیں۔ لاہور میں اس قسم کا مشاعرہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

[۵] راجہ سلطان مقصود پی۔سی۔ایس تاثیر کے ان چند مخصوص شاگردوں میں تھے جنہیں استاد کا قرب حاصل تھا۔ ادبی ذوق کے علاوہ سلطان مقصود کو موسیقی سے بھی شغف تھا اور مالکوس ان کی محبوب راگنی تھی۔ سلطان مقصود اسلامیہ کالج میں تقریباً تین برس رہے لیکن دو مرتبہ ان کا نام یونیورسٹی میں امتحان کے لئے یوں بھیجا نہ جا سکا کہ وہ کلاس سے اکثر غائب رہتے اور ان کی "حاضریوں" کی تعداد کم ہو جاتی۔ ہر مرتبہ مایوس ہونے کے بعد وہ کالج کی گراؤنڈ میں بیٹھ کر غالب کی غزل "عشق غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد" مالکوس میں گایا کرتے۔ اس اعتبار سے کچھ بے تکلف دوست انہیں محض مالکوس کے نام سے یاد کرتے۔ تاثیر جب بھی ان سے کسی شعر کے گانے کی فرمائش کرتے تو یہی مطالبہ ہوتا کہ مالکوس میں گایا جائے۔

[۶] ڈاکٹر سعید اللہ ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی کالج کے سٹاف میں تاثیر کے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی طبیعت میں بہت دخل تھا۔ کئی مرتبہ لوگوں نے یوں بھی دیکھا کہ اسلامیہ کالج کے دفتر کے سامنے کی سیڑھیوں پر تاثیر اور سعید اللہ دونوں کھڑے فوٹو اتروا رہے ہیں۔ یہ فوٹو کئی مرتبہ اترا لیکن بقول تاثیر، ڈاکٹر صاحب کی طبیعت سیر نہ ہوئی۔ سعید اللہ اپنے تبحر علم، خلوص، اور شفقت کی وجہ سے اپنے شاگردوں میں بہت مقبول تھے

لیکن چونکہ حد درجہ بیباک اور صاف گو تھے اس لئے کالج کے سٹاف میں اکثر لوگ ان سے نالاں رہتے۔ ان کی بیباکی کا یہ عالم تھا کہ جب تاثیر انگلستان کے لئے روانہ ہونے لگے تو بزم فروغ اُردو کے ارکان نے انہیں ایک الوداعی ڈنر دیا کھانے کے بعد تقریروں کے سلسلے کا اختتام ڈاکٹر صاحب کی اس تقریر پر ہوا جس میں انہوں نے ان سامعین کو جو تاثیر ایسے دوست کی مفارقت کے خیال پر آنکھوں میں آنسو لئے بیٹھے تھے صاف صاف کہہ دیا کہ تاثیر کی دوستی دلی نہیں بلکہ محض دماغی ہوا کرتی ہے۔ کچھ لوگ اس فقرے پر بہت برافروختہ ہو گئے لیکن حقیقت میں ڈاکٹر سعید اللہ نے جو کچھ کہا تھا وہ بہت صحیح تھا۔

[۷] پروفیسر عبدالواحد جو حکومتِ پاکستان کے محکمہ انفرمیشن میں آفیسر ان سپیشل ڈیوٹی ہیں اسلامیہ کالج میں تاثیر کے رفقاء میں سے تھے اور بزمِ فروغِ اُردو کے بہت سرگرم رکن۔ عبدالواحد تاثیر کے ان چند قریبی دوستوں میں سے تھے جنہیں تاثیر کو "تم" کہہ کر خطاب کرنے کا حق حاصل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تاثیر جو بعض اوقات اپنی ضد پر اڑ جایا کرتے تھے اور فریقِ ثانی سے اس امر کی توقع رکھتے تھے کہ وہ ان کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ عبدالواحد کو بحث مباحثے میں ضد کی بجائے استدلال سے قائل کرنے کی سعی کرتے تھے یہ بات اور ہے کہ اکثر و بیشتر یہ کشتی برابر چھوٹتی۔

[۸] پروفیسر حمید احمد خاں تاثیر کے چلے جانے کے بعد اسلامیہ کالج میں آئے۔ لیکن انہوں نے آتے ہی بزمِ فروغِ اردو میں ایک نئی جان پھونک دی اور اسکی مجالس کو ایک نیا رنگ دیدیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ڈاکٹر سعید اللہ، پروفیسر عبدالواحد اور خود پروفیسر حمید احمد خاں کالج کو چھوڑ کر چلے گئے اور بزم فروغ اُردو نے ان تینوں کی روانگی کے بعد جان توڑ دی کئی برس تک یہی حالت رہی اور کالج کی ادبی سرگرمیاں ماند پڑی رہیں۔ آخر ڈاکٹر تاثیر پرنسپل

مقرر ہوتے اسلامیہ کالج کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آئی۔ حمید احمد خاں بھی اس دوران میں اپنے پرانے کالج میں لوٹ آئے بزمِ فروغِ اردو کا دوبارہ احیا ہوا تو حمید احمد خاں اس کے صدر مقرر ہوئے۔ حمید احمد خاں اور تاثیر میں ایک بات خاص طور پر مشترک تھی دونوں اپنے شاگردوں کے ادبی ذوق کا بہت خیال رکھتے۔ اگر کسی طالب علم میں ذرا بھی ادبی مَس نظر آتا تو دونوں اس کے ذوق کی تکمیل کے لئے گویا اس کے سر ہو جاتے۔ ہمارے ادیبوں میں آج کئی نوجوان ایسے ہیں جنہیں تاثیر یا حمید احمد خاں کی توجہ نے اس مرتبے پر پہنچایا ہے جس پر وہ نظر آتے ہیں۔

[۹] تاثیر کو اپنے شاگردوں میں سے حفیظ جاوید کے ساتھ ایک خاص لگاؤ تھا۔ وہ ان کی صلاحیتوں کے اس قدر قائل تھے کہ جا و بیجا انکی تعریف کرتے بلکہ ان کی ذہانت سے دوسروں کو بھی مرعوب کرنے کی سعی کرتے۔ بدقسمتی سے کیمبرج روانہ ہونے سے چند روز قبل دونوں دوستوں میں بعض نامعلوم وجوہ کی بنا پر کچھ شکر رنجی سی ہو گئی اس کے دور کرنے کے وسائل ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے کہ تاثیر سفر پر روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد اختلاف کے وجوہ پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اسے طرح طرح کے رنگ دیئے گئے حفیظ جاوید کی خاموشی سے حاشیہ آرائی کو اور تقویت مل گئی اور کئی افسانے اِدھر اُدھر مشہور ہو گئے۔ تاثیر کے دوستوں کو اس بات کا بہت رنج پہنچا۔ انہیں اوّل تو اسی بات کا گلہ تھا کہ تاثیر نے ایک شاگرد کو اپنا ایسا مقرّب کیوں بنایا۔ پھر انہیں اس بات کی بھی شکایت تھی کہ تاثیر ان افسانوں کے بارے میں ان سے کھل کر بات کیوں نہیں کرتے۔ کئی دوستوں نے انہیں انگلستان میں خط لکھے اور یہاں تک کہہ دیا کہ جو بھی افسانے اس شکر رنجی کے بارے میں پھیلے ہوئے تھے وہ ان پر ایمان رکھتے تھے۔

[۱۰] بزمِ فروغِ اردو میں جو مقالات پڑھے گئے تھے انہیں "فروغِ اردو" کے نام سے

کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا تھا۔ اس کتاب کی صرف دو سو بائیس کاپیاں چھاپی گئی تھیں جن میں سے بائیس کاپیاں تو ارکان اور معاونین میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ ایک سو پچاس ہندوستان کے جملہ اخبارات و رسائل کو بغرض ریویو اور لائبریریوں کو بطور تحفہ بھیجی گئی تھیں، باقی پچاس کاپیاں کتب فروشوں کو بھجوا دی تھیں کہ جو لوگ اسے خریدنا چاہیں وہ اس کے مطالعے سے محروم نہ رہیں۔ اس کتاب پر بہت شاندار ریویو ہوئے۔ پسند کرنے والوں میں سر محمد اقبال، سر عبدالقادر، سید سلیمان ندوی، نواب نصیر حسین خیال وغیرہ کے نام شامل تھے۔ ارادہ یہ تھا کہ اس کتاب کی کچھ کاپیاں انگلستان کے مستشرقین کو بھی رائے کی غرض سے دی جائیں۔ تاثیر نے چلنے سے قبل وعدہ کیا تھا کہ اگر وہاں کوئی قابلِ توجہ مستشرق نظر آیا تو وہ ضرور اس کی رائے معلوم کر کے ہمیں لکھیں گے۔

[۱۱] مکتوب الیہ کو سینما کے فنی پہلو سے بہت لگاؤ تھا۔ چنانچہ اس کا ارادہ سینما کے بارے میں ایک فنی کتاب لکھنے کا تھا۔ تاثیر سینما کے کچھ ایسے دلدادہ یا شوقین نہیں تھے۔ سینما کے بارے میں ان کی معلومات بھی کچھ ایسی قابلِ اعتماد نہ تھیں لیکن انگلستان پہنچتے ہی انہوں نے پکچر گوئر میں ایک مضمون دیا جس کا کچھ چرچا بھی ہوا۔ یہ مضمون دراصل انگریز پروڈیوسروں کیلئے ایک مشورہ تھا کہ وہ امریکی فلموں کے مقابلے میں ہندوستان میں اپنی مصنوعات کو فروغ دینے کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کریں مگر یہ مضمون غالباً پہلا اور آخری تھا جو انہوں نے اس موضوع پر لکھا۔

[۱۲] ابوالاثر حفیظ جالندھری تاثیر کے بہت پرانے دوست تھے۔ دونوں کے درمیان کئی مرتبہ اختلافات ہوئے لیکن دونوں پھر گلے مل گئے اور جو لوگ انہیں ایک دوسرے سے الگ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے ہاتھ مل کر رہ گئے۔ حفیظ اس زمانے میں سر عبدالقادر کے مشورے پر انگلستان جانے کی سوچ رہے تھے۔ تاثیر کا غالباً خیال یہ تھا

کہ انگلستان کے سفر سے انہیں کچھ حاصل نہ ہوگا بلکہ اُلٹا مالی نقصان ہوگا۔ لیکن حفیظ تاثیر کے مشوروں کے برخلاف لندن پہنچے اور وہاں کی مجالس کو گرمانے کے بعد واپس آئے تو نہ صرف انگریز بیوی کی معیت میں تھے بلکہ صحت کی شکایات بھی پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ حفیظ اور تاثیر ایسے بے تکلف دوست تھے کہ ایک دوسرے کی خامیوں اور کمزوریوں کو خوب جانتے تھے۔ اسی وجہ سے جب کبھی وہ ایک دوسرے پر فقرے بازی کرتے تو سُننے والوں کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو جاتا۔ ایک صحبت میں تاثیر اور حفیظ کے درمیان ہنسی مذاق ہو رہا تھا تاثیر کہہ رہے تھے کہ حفیظ کی شاعری کی مقبولیت میں حفیظ کے ترنم کا بہت دخل ہے اور خود ترنم میں حفیظ کے دانتوں کی نمائش کا بہت ہاتھ ہے۔ ظاہر ہے یہ باتیں محض مذاق کے لئے تھیں۔ چنانچہ حاضرینِ مجلس جن میں تاثیر کے ایک شاگرد بھی تھے ہنس دیئے تھوڑی دیر کے بعد موضوع پلٹا اور معاملہ جسمانی صفائی پر آ گیا۔ حفیظ نے تاثیر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ بھئی ہم تو ہر اُس شخص کی قدر کرتے ہیں جو اپنی دُھن کا پکّا ہو سو تاثیر کے قائل ہیں کہ یہ بچپن میں اگر مہینے میں ایک مرتبہ نہاتے تھے تو آج بھی مہینے میں ایک ہی مرتبہ نہاتے ہیں۔ حفیظ نے یہ بات کچھ اس طرح سنجیدگی سے کہی کہ حاضرین میں سے کم از کم شاگرد والا رشید کو اپنے استاد کے کمالات کا ضرور ایک اور اعتراف ہُوا۔ لیکن جیسے ہی شاگرد وہ چلے گئے۔ تاثیر حفیظ سے بہت خفا ہوئے۔

[۱۳] تاثیر کا خیال ہمیشہ یہ رہا کہ ہمارے ہاں اردو ادب کی تاریخ پر کوئی معقول کتاب نہیں۔ وہ کہا کرتے تھے جن لوگوں نے یہ کتابیں لکھی ہیں ان میں سے اکثر کو ادبی تنقید کے مبادیات تک کی اطلاع نہیں۔ وہ ایک کتاب خود لکھنا چاہتے تھے ۱۹۴۳ء میں انہوں نے اس کتاب کا ایک ڈھانچہ بھی تیار کر لیا تھا پھر اس کام پر اپنے کچھ شاگردوں

کو بطور رفقا کار آمادہ کیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد وہ خود کیمبرج چلے گئے اور یہ کام رہ گیا۔

[۱۴] صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ایم۔اے تاثیر کے دیرینہ دوست اور گورنمنٹ کالج کے مشہور استاد۔ تبسم شاید تاثیر کے ان چند دوستوں میں سے تھے جنہیں ان کا رازدار ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ تاثیر کے ہاں کوئی مجلس اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی، جب تک تبسم اس میں شرکت نہ کریں۔ تاثیر انہیں "سوفا" کے بے تکلف لقب سے یاد کرتے اور مجالس میں اپنے مذاق کا رخ اکثر انہیں کی طرف رکھتے۔ کالج کی معلمی کے زمانے میں جب گھر پہ بیٹھے بیٹھے ان کی طبیعت اکتا جاتی تو تاثیر دوستوں کو لیکر صوفی صاحب کے مکان پر چلے جاتے جہاں رات گئے تک کشمیری چائے کے دور میں محفل گرم رہتی اور تاثیر کے قہقہے سڑک پر گونجتے ہوئے سنے جاتے۔

[۱۵] عبدالرشید طارق تاثیر کے عزیز شاگردوں میں سے تھے۔ تاثیر کو ان سے یوں بہت سی توقعات تھیں کہ ان کے شاگردوں کی فہرست میں وہی ایک ایسے فرد تھے جو اپنی تعلیم کی طرف بہت اہتمام سے توجہ دیتے۔ بعض دوسرے شاگردوں کی یہ کیفیت تھی کہ اگر وہ تاثیر کی صحبت میں دیر تک بیٹھے رہتے تو تاثیر ان سے گفتگو میں مصروف رہتے لیکن اگر طارق زیادہ دیر تک بیٹھتے اور تاثیر کو شبہ گذرتا کہ اس صحبت میں ان کا وقت ضائع ہو رہا ہے تو وہ انہیں اٹھا دیتے۔ بی۔اے کے امتحان کے بعد طارق گورنمنٹ کالج میں چلے گئے لیکن تاثیر برابر ان کے تعلیمی مشاغل کی طرف متوجہ رہے۔ آخر ایم۔اے کا نتیجہ نکلا اور طارق سیکنڈ کلاس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس سے تاثیر کو بہت مایوسی ہوئی اور جو توقعات باقی رہ گئی تھیں وہ اس وقت جاتی رہیں جب تلاش معاش سے مجبور ہو کر طارق کابل میں برطانوی سفارتخانے میں میر منشی کے نائب ہو کر ادبی دنیا سے ہمیشہ کیلئے الگ ہو گئے

[۱۶] بشیر احمد، ناظم علی اور ابو سعید یہ سب تاثیر کے شاگرد اور بزمِ فروغِ اردو کے سرگرم کارکن تھے۔

[۱۷] پنڈت ہری چند اختر ایم۔ اے۔ بزمِ فروغ کی سرگرمیوں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے پنڈت جی اسلامیہ کالج کے طلبہ کے بہت قریب ہو گئے تھے۔ چونکہ پنڈت جی اور تاثیر بہت دوست تھے اس لئے تاثیر کے شاگردانِ خاص پنڈت جی کی بہت عزت کرتے اور اپنی ادبی کاوشوں میں ہمیشہ ان سے مدد چاہتے۔ بزم کی اکثر مجالس میں پنڈت جی نہ صرف صدارت کے فرائض انجام دیا کرتے بلکہ طلبا کی کئی کامیاب تحریریں آپ ہی کے ادبی مشوروں کی مرہونِ منت ہوا کرتیں۔ پنڈت جی آخر تک بزم کی سرگرمیوں سے متعلق رہے اور جب تاثیر، سعید اللہ، عبدالواحد، حمید احمد خاں لاہور سے چلے گئے تو پنڈت جی بھی کچھ عرصہ بعد دہلی تبدیل ہو گئے۔

[۱۸] ڈاکٹر جہانگیر خاں ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ تعلیم پنجاب۔ جہانگیر خاں بھی اسلامیہ کالج کے طالبعلم تھے، انڈین کرکٹ ٹیم کے ساتھ انگلستان گئے تو ٹیم کے دورے کے خاتمے پر کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہو گئے۔ تاثیر جب وہاں پہنچے تو جہانگیر پہلے سے موجود تھے، شروع میں دونوں کی بہت دوستی رہی لیکن بعد میں سیاسی اختلافات ہو گئے اور پھر دوستی محض ملاقات میں بدل گئی۔

[۱۹] دریائے راوی کے مغربی کنارے پر شاہدرے سے تین چار میل جنوب کی طرف کامران کی بارہ دری ہے جو لاہور کے لوگوں کیلئے تفریح اور سیر کا مرکز ہے۔ گرما کے ایام میں جب دن کی تمازت اور شام کے حبس میں لاہور کے بے فکروں کا دم گھٹنے لگتا ہے تو وہ دوستوں کی معیت میں تانگوں پر سوار ہو کر کامران کی بارہ دری میں رات بسر کرنے

چلے جاتے ہیں رات بھر ہنستے کھیلتے، دریا میں نہاتے بارہ دری کے وسیع احاطے میں دوڑتے کٹ جاتی ہے۔ بزمِ فروغِ اردو کے ارکان بھی کامران کی بارہ دری میں رات بسر کرنے چلے جایا کرتے۔ اس تفریح کی ابتدا خود تاثیر کے ایما پر ہوئی۔ اخراجات کے کفیل ڈاکٹر سعید اللہ ٹھہرے۔ اہتمام صوفی تبسم کے سپرد ہوا۔ پہلی سیر بہت دلفریب رہی۔ کچھ عرصے کے بعد پھر کامران کی بارہ دری کا رُخ ہوا لیکن اب کے قسمت یاور نہ تھی۔ ہُوا یوں کہ پنڈت ہری چند اختر کے لئے جو اس سفر میں ساتھ تھے کسی کو کھانے کے انتظام کا خیال نہ رہا۔ بارہ دری میں پہنچ کر رات کے دس بجے جب کھانا چُنا گیا تو حقیقتِ حال سے آگاہی ہوئی۔ فوراً تین آدمی شاہدرے کے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کی واپسی تک کے لئے کھانا ملتوی کر دیا گیا۔ جب رات کے بارہ بج چکے اور شاہدرے سے خرید و فروخت کر کے لوگ نہ لوٹے تو کچھ اور لوگ ان کے پیچھے گئے جب وہ بھی نہ آئے تو ملازموں کو چھوڑ کر باقی بھی صورتِ حال کا پتہ لینے کے لئے نکلے۔ جو لوگ ان سے پہلے گئے تھے وہ شاہدرے کے تھانے کے پاس کھڑے سپاہیوں سے جھگڑ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ سب سے پہلا گروہ ایک پنڈت سے کھانے کی اشیا خرید کر جب واپس لوٹ رہا تھا تو راستے میں اسے پولیس نے بغیر بتی کے سائیکل چلانے کے جرم میں دھر لیا۔ چونکہ ضمانت دینے والا کوئی نہ تھا اس لئے وہ اور ان کے بعد دوسرا گروہ وہیں بحث میں اُلجھے ہوئے تھے۔ بہر حال اس رات ادیبوں کی یہ مجلس اپنا سارا وقت پولیس کی نذر کر کے واپس پہنچنے پر مجبور ہوئی۔

[۲۰] تاثیر پان کے بہت دلدادہ تھے۔ ان کے ہاں ہر وقت پانوں کا دور چلتا۔ شہر کے مختلف پان فروشوں کے عیب و ثواب کا انہیں علم تھا سارا دن نام گنواتے۔ لیکن انگلستان کے قیام کے دوران میں چونکہ پان نہیں مل سکتے تھے اس لئے سفر پہ روانہ ہونے سے قبل انہوں نے پان کھانا ترک کر دیا تھا۔ وہاں پہنچے تو اصغر علی محمد علی کے کارخانے کی بنی ہوئی پان میں کھانے والی تمباکو کا مطالبہ ہونے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بات ہے۔ بہت

عرصے کے بعد راز کھلا کہ "گولی نقرہ" کس غرض سے طلب کی جا رہی تھی۔ سر آرتھر کولرکورچ جو تاثیر کے کیمبرج یونیورسٹی میں ٹیوٹر تھے سگریٹ نہیں پیتے تھے البتہ سگار کا تمباکو ضرور چباتے تھے۔ تاثیر نے انہیں بتلایا کہ ان کے ہاں ایک خاص قسم کا بے ضرر مگر خوش ذائقہ تمباکو ملتا ہے جس کا استعمال شاید انہیں پسند آئے۔ جیسے ہی سر آرتھر نے فرمائش کی تاثیر نے خطوں کا طومار باندھ دیا۔ آخر ہوائی ڈاک کے ذریعے گولی نقرہ ارسال کی گئی۔ سر کولرکورچ نے اسے استعمال کیا۔ پہلے تو انہیں پسند آئی لیکن کچھ عرصے کے بعد انہیں اسکی خوشبو اور ذائقہ ناپسند ہوئے اور یوں گولی نقرہ فیشن میں داخل ہوتے ہوتے رہ گئی۔

[۲۱] بدرالدین بدر مرحوم تاثیر کے ان پُرخلوص دوستوں میں سے تھے جنہوں نے اپنی عمر رفیقوں کی خدمت گذاری میں کاٹ دی اور آخر اسی خدمت میں جان دے دی۔ تاثیر سے ان کی سب سے اول کب ملاقات ہوئی اس کا حال تاثیر اور بدر کے سوا کوئی نہیں جانتا چونکہ دونوں میں سے آج کوئی زندہ نہیں اس لئے اس کا صحیح علم کسی کو نہیں۔ تاثیر کے جاننے والے صرف یہ جانتے ہیں کہ جب سے انہیں تاثیر کی بزم میں اجازت ملی بدر پہلے سے وہاں موجود تھے۔ بدر ان لوگوں میں سے تھے جو محض دوست کی دوستی سے غرض رکھتے ہیں اس کے ذاتی عیب و صواب میں دخل نہیں دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کبھی اپنے کسی دوست کے خلاف نہ خود کچھ کہنے کی جرأت کی نہ اس کے خلاف کسی اور سے کچھ سنکر بے حمیتی سے خاموشی اختیار کی۔ تاثیر کے بارے میں کئی باتیں ان کے دوسرے عزیز دوستوں کے دل میں کھٹکتی تھیں لیکن بدر نے نہ تو کبھی خود ان باتوں کی طرف عذر کیا نہ ان باتوں کے تذکرے کو پسند کیا۔ بدر جب دہلی میں "فوجی اخبار" کی ادارت میں تھے تو ان کا معمول تھا کہ اتوار کے دن کسی نہ کسی دوست کے ہاں چلے جاتے۔ دن بھر چونکہ وہاں رہنا مقصود ہوتا اس لیے دوست کے بچوں کیلئے تحائف یا کھانے کے لئے اشیا اور پھل لے جاتے۔ سارا دن دوست کے بیوی بچوں کا دل بہلاتے، شام ہوتی جیب سے بس کا ٹائم ٹیبل نکالتے وقت

دیکھتے اور وہ تین الوداعی فقرے کہہ کر رخصت ہو جاتے۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ بعض دوستوں کو اپنی بیویوں کی مرضی یا اطلاع کے بغیر شام کے لئے کہیں جانا مقصود ہوتا۔ بیویاں ایک دوست کے مکان پر جمع کر دی جاتیں۔ بدر کو بلایا جاتا۔ ان کی منت کی جاتی کہ وہ دوستی کے حق ادا کریں۔ دوست رخصت ہو جاتے اور بدر رات گئے دوستوں کی واپسی تک ان خواتین کو کہانیاں لطیفے چٹکلے سنائے چلے جاتے۔ کھانے پکانے پر بحث چھیڑ دیتے، کتابوں کا تذکرہ لے بیٹھتے، بچوں کی نگہداشت کا ذکر شروع کر دیتے غرضیکہ کولرج کے اینشنٹ میرینر کی طرح انہیں اپنی داستان میں کچھ ایسا محو کر لیتے کہ گذرتے وقت کا پتہ نہ چلتا۔ جب دوست سینما، تھیٹر یا کلب کی آوارہ گردی سے واپس آتے بدر کی جان چھوٹتی اور بیچارے اپنے گھر کی راہ لیتے۔ افسوس ۱۹۴۴ء کے وسط میں یہ عجیب و غریب شخصیت تین ماہ دق کے آخری مدارج میں الجھ کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ ایک ہندو دوست کے ہوٹل کو مقامی لوگوں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لئے بدر نے اپنی جان پر ایسی ایسی آفتیں جھیلیں کہ صحت جواب دے گئی آخر دق ہوئی اور ایسے عالم میں کہ ہسپتال میں ان کے نزدیک کوئی بھی نہ تھا وہ انتقال کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

[۲۲] تاثیر نے بزمِ فروغِ اردو کے لئے مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا وہ وعدہ اس خط کی صورت میں پورا کیا گیا۔ چنانچہ اس خط کے ابتدائی کلمات کو بدلکر اسے جوں کا توں بزم میں پیش کیا گیا۔ اس مجلس کی صدارت کے فرائض حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری نے انجام دیئے۔ مجلس کا افتتاح تاثیر کے تازہ اردو کلام سے ہوا جو پروفیسر عبد البشیر آذری نے گا کر سنایا، اس کے بعد پنڈت ہری چند اختر نے یہ "مقالہ" پڑھا۔ مضمون کے آخر میں بحث و تمحیص کا آغاز ہوا جس کے اختتام پر حضرت شمیم بہاری، حفیظ ہوشیارپوری، پروفیسر تبسم، پنڈت ہری چند اختر اور ابوالاثر حفیظ نے اپنا تازہ کلام سنایا۔ یہ مقالہ بعد میں "فارسی ادب کے چند گمشدہ اوراق" کے عنوان سے فروغِ اردو کی دوسری جلد میں شائع کیا گیا

[۲۳] سیّد بشیر ہندی "شبستان" کے نام سے ایک پرچہ فلمی دُنیا کے بارے میں نکالتے تھے
اس پرچے میں آغا حشر کے عنوان سے ایک مضمون "ایک واقف حال" کی طرف سے چھپا۔
اس مضمون میں آغا صاحب کے فن اور ان کے طرزِ کار پر سخت تنقید تھی۔ لکھنے والے اصل میں تاثیر کے
ایک شاگرد تھے لیکن جب آغا صاحب نے عدالتی چارہ جوئی کی تو بشیر ہندی نے اس مضمون کی ساری
ذمّے داری اپنے اُوپر لے لی اور اس کے اصل لکھنے والے کا نام آخر دم تک صیغۂ راز میں رکھا۔
اس مضمون پر بہت چہ میگوئیاں ہوئیں۔ مولینا چراغ حسن حسرت جو آغا صاحب کے دوست اور تاثیر
کے مونس و دمساز تھے، اسے تاثیر کی تحریر پر محمول کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ انہوں نے کئی
وہ باتیں جو اس مضمون میں آغا صاحب کی مخالفت میں کہی گئی تھیں خود تاثیر کے مُنہ سے سُنی
تھیں۔ بات صرف یہ تھی کہ اصل مضمون نگار نے بھی بعض باتیں تاثیر ہی سے سُنی تھیں۔ بہر حال
اس مقدمے نے بہت طول کھینچا۔ بشیر ہندی کو ہر مرتبہ مقدمے کی سماعت کے سلسلے میں کلکتے جانا
پڑتا تھا، انہوں نے آغا صاحب کے خلاف ایک مقدمہ ایسا ہی لاہور میں کھڑا کر دیا۔ اب اسکی
پیروی کے لئے آغا صاحب کو ہر دوسرے تیسرے ہفتے یہاں آنا پڑتا۔ آخر مصالحت کی صورت
نکالی گئی، حسرت اور امتیاز علی تاج نے صفائی کرا دی۔ مقدمات واپس لے لئے گئے۔

[۲۴] "نگار" نے جوش کی ایک نظم پر جس کی ردیف "ہم لوگ" تھی ایک تنقید چھاپی تھی۔
تاثیر کا خیال تھا کہ یہ تنقید ادبی بد دیانتی یا ادبی بے بہرہ پن کا نتیجہ تھی چنانچہ انہوں نے اس نظم
کی حمایت میں ایک طویل مضمون "نیرنگ خیال" میں نظامی قدوسی ایم۔ اے کے فرضی نام سے چھاپا۔
گو اس کا جواب نگار کی طرف سے نہیں آیا لیکن تاثیر "نگار" کے مضامین پر نظر رکھتے۔ اس دوران
میں "نگار" نے مذہبی معاملات پر نیاز فتحپوری کے بعض ایسے مضامین کا سلسلہ شروع کیا جس سے
عامتہ المسلمین کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگنے کا احتمال تھا۔ اُن کے خلاف ملک کے ہر گوشے سے
آواز اٹھائی گئی آخر نیاز نے از خود مسلمانوں سے یہ کہہ کر معافی مانگ لی کہ یہ مضامین فی الواقعی
قابلِ اشاعت نہیں تھے۔ جب تاثیر کو اس صورتِ حال کا علم ہُوا تو انہوں نے نیاز کے اس

معافی نامے کو دیکھنا چاہا۔

[۲۵] بعض غلط فہمیوں کی بنا پر بزمِ فروغِ اُردو کے بعض افراد میں کچھ شکر رنجی کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ ہُوا یوں کہ ایک مضمون کے خاتمے پر جب بحث کا آغاز ہُوا تو صاحبِ مضمون اس کے رُخ کو دیکھ کر کچھ بدک گئے، بحث میں گرمی کا انداز پیدا ہو گیا، بات دُور نکل گئی، جب مجلس برخاست ہوئی تو پنڈت ہری چند اختر افسردہ ہو چکے تھے۔ استادوں کے زمرے میں سے بھی ایک آدھ فرد کو اُس دن کی کارروائی ناگوار گذری، چنانچہ کچھ لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ اور بزم کی صفوں میں ایک انتشار کی صورت پیدا ہونے لگی۔ مگر ڈاکٹر سعید اللہ نے موقع کو سنبھال لیا اور مجلس منتشر ہونے سے بروقت بچ رہی۔

[۲۶] انگلستان کے سفر پر روانہ ہونے سے کچھ عرصہ قبل تاثیر اور خان بہادر عبدالرحمن چغتائی کے درمیان بعض ایسی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں جنہوں نے بعد میں بہت افسوسناک صورت اختیار کر لی۔ تاثیر وطن سے دُور تھے اس لئے عملی طور پر اُس اختلافی مہم میں حصہ نہیں لے سکتے تھے جو اُن کے جانے کے بعد اخبارات و رسائل میں بڑی شد و مد سے شروع ہوئی تھی۔ لیکن چغتائی کے بعض مداحوں، عزیزوں اور دوستوں نے تاثیر کے خلاف دل کھول کر لکھا۔ چنانچہ ماہنامہ "نرگس" میں جو مضمون تاثیر کے خلاف چھپا وہ ایک افسوسناک چیز تھی۔ کچھ عرصے کے بعد یہ مہم خود بخود دب گئی غالباً اس لئے کہ اس کو جاری رکھنے کے لئے تاثیر موجود نہ تھے اور ان کے رفقا میں سے کسی میں اتنی استعداد نہ تھی کہ فریقِ مخالف کا مقابلہ کر سکتا۔ گو تاثیر اور چغتائی کے درمیان اصل مصالحت صرف اس وقت ہوئی جب تاثیر لندن سے لاہور پہنچے لیکن کچھ عرصے کے بعد کدورتیں دل سے معاف ہونے لگیں تھیں، اس خط کے آخری فقرے ایسے وقت میں لکھے گئے تھے جب مخالفت کا ہلکا ہلکا زہر دل میں موجود تھا اس اعتبار سے یہ فقرے تاثیر کے اس غیر شعوری ردِّ عمل کا نتیجہ تھے جو اس مہم کے خلاف ان کے دل میں پیدا ہوا۔

[۲۷] تاثیرؔ نے فروغِ اردو کی دوسری کتاب کے لئے دیباچہ لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ وعدہ علمی مصروفیات کی وجہ سے پورا نہ کیا جا سکا۔ اس خط کے کچھ عرصے کے بعد کتاب اشاعت کے لئے چھاپے خانے میں جا چکی تھی۔ اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس کی ابتدائی تین چار سطروں کو حذف کر کے باقی خط کو دیباچے کی صورت میں کتاب کے ساتھ شامل کر لیا جائے۔

[۲۸] تاثیرؔ ریڈیو کے بھی ایک کامیاب فنکار تھے، ان کی تقریروں کا سلسلہ "برلن کی خبریں" زمانہ جنگ کا ایک مشہور نشریہ تھا۔ لیکن ۱۹۳۴ء میں جب ہندوستان میں صحیح طور پر نشریات کا آغاز نہ ہوا تھا تاثیرؔ نے ایک ایسا مکالمہ غالبؔ کے کلام کو سامنے رکھ کر لکھا جو ریڈیو کی تکنیک کی ایک نہایت کامیاب مثال ثابت ہوا۔ یہ مکالمہ "نیرنگِ خیال" میں "غالبؔ کے گھر پہ ایک شام" کے عنوان سے شائع ہوا، اور بعد میں کئی مرتبہ ریڈیو پر کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا۔

[۲۹] تاثیرؔ کو موسیقی سے بہت رغبت تھی۔ کلاسیکی موسیقی کے گراموفون ریکارڈوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہمیشہ ان کے ہاں جمع رہتی۔ جب کوئی ایسا دوست ان کے ہاں جاتا جسے موسیقی سے لگاؤ ہوتا تو جہاں اسکی تواضع خلیفے کے کباب جہانگیر ہوٹل کی مچھلی، بنگالی کے رس گلے اور رستم کے پان سے کی جاتی وہاں ان گراموفون ریکارڈوں میں سے کسی نہ کسی تازہ ترین چیز کو بھی پیش کیا جاتا۔ ان ریکارڈوں میں زیادہ تعداد نرائن راؤ ویاس اور اس کے ساتھی مرہٹہ گانے والے اور واسیلوں کی تھی۔ لیکن اس ذوق کے باوجود یہ لطیفہ تاثیرؔ کے اکثر دوستوں میں مشہور تھا کہ ایک مرتبہ اپنے ایک شاگرد کے روبرو انہوں نے ایک تازہ ریکارڈ کی تعریف کی جس کے ایک طرف تلک کامود اور دوسری طرف درگا تھا۔ وہ درگا کی تعریف کرنے لگے اور اس شاگرد سے اسی رُخ کو بجانے کے لئے کہا جب ریکارڈ شروع ہوا تو تاثیرؔ واہ واہ کے ساتھ داد بھی دینے لگے۔ بارے ریکارڈ ختم ہوا شاگرد نے دیکھا، اٹھایا لیکن دیکھا تو درگا نہیں بلکہ تلک کامود والا رُخ تھا۔ تاثیرؔ سے انہوں نے

پوچھا حضرت یہ کیا چیز تھی۔ بولے درگا۔ انہوں نے کہا معاف کیجئے یہ درگا نہیں بلکہ اتفاق سے تلک کا موڑ تھا۔ بولے یہ بھی بہت اچھا تھا۔

[۳۰] مولینا چراغ حسن حسرت۔

[۳۱] تاثیر اپنے شاگردوں میں مطالعے کا ذوق پیدا کرنے کے لئے ایک طریقہ یہ بھی استعمال کرتے کہ انہیں بعض کتابوں کے پڑھنے سے۔ اس طریق سے منع کرتے کہ ان کا اشتیاق اور تیز ہوتا۔ مثلاً وہ جانتے تھے کہ موپساں کے افسانے اپنی بے باک تحریر اور فرانسیسی سوسائٹی کی نقشہ کشی کی وجہ سے نوجوان طلبہ کے لئے ضرور جاذبِ توجہ ہوں گے اور اگر ان کا مطالعہ شروع کیا گیا تو موپساں کی دوسری کتابیں بھی قاری کو اپنی جانب کھینچیں گی اور یوں یہ سلسلہ چل نکلے گا۔ چنانچہ تاثیر کلاس میں طلبہ سے کہتے کہ فلاں فلاں کتاب جو لائبریری میں غلطی سے آگئی ہے ان کے مطالعہ کیلئے ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔ طلبا کی آتشِ اشتیاق بھڑک اٹھتی۔ اور لوگ اپنے ذاتی تعلقات کے بھروسے لائبریری کے چکر کاٹنا شروع کر دیتے۔ اور جب وہاں سے نہ مل سکتی تو بازار سے خرید کر پڑھتے اور دوسروں کو بھی مطالعہ کے لئے عاریتہً دیتے۔ تاثیر نے اپنے کئی شاگردوں میں کتابوں کے مطالعے کا ذوق اسی طریق سے پیدا کیا۔

[۳۲] "جوتی" مشاعرہ اسلامیہ کالج کے بعض طلبہ کی اپنی اختراع تھی۔ اس کا انعقاد زیادہ تر کالج کی گراؤنڈ یا پھر حبیبیہ ہال کے کسی خاموش کونے میں ہوتا۔ اس میں حصّہ لینے والے طلبہ صرف چھ سات بے تکلف دوست ہوتے جن میں سے عبدالبشیر آذری کے سوا اور کوئی شاعر کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ یہ مشاعرہ خالصتہً ہزل کا مشاعرہ ہوتا اور اسکی کارروائی یوں ہوتی کہ کسی شاعر کے مطبوعہ کلام میں سے فال کے طور پہ ایک مصرع طرح کے لئے چن لیا جاتا۔ حصّہ لینے والے گول دائرے کی صورت میں ساتھ ساتھ بیٹھ جاتے۔ درمیان میں ایک جوتا رکھ لیا جاتا۔ شعر گوئی کا آغاز کسی ایک شخص کی طرف سے کیا جاتا جسے غزل کا پہلا شعر

(مطلع کی شرط نہ تھی) موزوں کرنے کے لئے پانچ منٹ کا وقت دیا جاتا۔ جیسے ہی پانچ منٹ ختم ہوتے اور اس دوران میں منتخب شخص شعر کہنے سے قاصر رہتا تو اس کے سر پہ جوتا رسید کر دیا جاتا۔ اس کے بعد دوسرے کی باری آتی۔ لیکن اسے وقت نہیں دیا جاتا تھا۔ اگر اس نے شعر موزوں کر دیا تو تیسرے کی باری آجاتی ورنہ دوسرے کی بھی وہی درگت بنتی جو پہلے کی بن چکی ہوتی۔ اگر دورانِ مشاعرہ میں مطلع اور مقطع خود بخود ہو جاتے تو مجلس کو بہت کامیاب سمجھا جاتا ورنہ ایک راؤنڈ کے بعد سب مل کر طبع آزمائی کرتے، مطلع اور مقطع نکالا جاتا اور غزل مکمل ہو جاتی۔

[۳۳] مسٹر عبداللہ یوسف علی جب پہلی مرتبہ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے، ڈاکٹر تاثیر جے اے وی کلاسوں کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ یوسف علی سخت مزاج آدمی تھے اور تاثیر نے کسی کے آگے جھکنا نہیں سیکھا تھا سو تاثیر کو کچھ عرصے کے بعد کالج سے الگ ہونا پڑا۔ بعد میں جب الیگزنڈر رولسن پرنسپل مقرر ہوئے تو تاثیر ۱۹۲۸ء میں اسلامیہ کالج میں لوٹ آئے۔ اتفاق سے ۱۹۳۵ء میں جب تاثیر کیمبرج میں تھے تو مسٹر یوسف علی پھر اسلامیہ کالج میں پہنچ گئے لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ مسٹر یوسف علی کے لئے کالج میں ٹھہرنا مشکل ہو گیا اس وقت کئی لوگوں کا خیال تھا کہ اگر تاثیر جلد واپس لوٹ آئیں تو شاید ان کا نام کالج کے پرنسپل کے عہدے کے لئے تجویز کیا جا سکے ::